غالبٌ علیٰ کلِّ غالبٍ

سیرِ غالب

مرتبہ

حکیم ابوالحسنات بیدل فاروقی صدر
دارالحسنات میرکوٹ سہارنپور
سابق صدر شعبۂ عربی فارسی اُردو محکمۂ تعلیمات
میسور

ہدیہ چار روپے

فخرِ انتساب

نہایت مسرت کا مقام ہے کہ ہم اپنے اس ادبی شہکار "بیبرِ غالب" کو پورے ادب و احترام کے ساتھ ایسی پُر وقار، مقتدر، مفتخر ہستی کے نام منسوب کر رہے ہیں جن کی ذوالخاصہ شخصیت علم و حکمت کی طبی، عملی فنکاریوں کی سرپرستی کے ساتھ ادبی علوم و فنون کی سرپرستی میں بھی پیش بیش ہے۔ اور آنمحترم کے زیرِ اقتدار "غالب اکیڈمی" کا وجود اس کی مبرہن صورت ہے۔

یعنی صدر الاطباء رئیس الحکماء ہمدم ملک و ملت ہمدرد فن معلّٰی بالقابہ عالیجناب الحاج حکیم عبد الحمید صاحب صدر ہمدرد وقف، دہلی، کے نام نامی اور اسم گرامی سے یہ پیش کش معنون ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

حکیم ابو الحسنات بیدل فاروقی
احسن المطب
شاہ ولایت سہارنپور

بعونہ و کرمہ

اشاریہ

حُسنِ قبول اگرچہ اک خداداد نعمت ہے مگر ہر چیز کا ایک پسِ منظر ضرور ہوتا ہے جو اس کے لئے بنیادی وجوہ کے استحکام کا مقام رکھتا ہے۔ اُردو ادب میں نظم کو جو برتری میسّر ہے اس میں بھی غزل کو وہ اس کے ذوقِ جمالیات ہی کی وجہ سے ہے۔ کسی کلام کی شرح و بسط اور تفصیل کی نوبت جب آتی ہے کہ وہ یا تو ادق ہو بلا وضاحت اور تشریح کے مطالب تک پہنچنا دشوار ہو یا عسیر الفہم ہو، یا پھر اس میں ایسی جامعیت ہو کہ جس کا تنوّع تفصیل کا طالب ہو اور "المعنی فی بطن الشاعر" سے گزر کر کمال ندرت سے ہم آہنگ ہوتے ہر یہ ضروری سمجھا جائے کہ اس کے جملہ رُخ اجاگر ہو جائیں، جتنی کیفیات شعر کا شعر حامل ہے اس کے ظہور و بروز کو مختلف پیرائیہ بیانات سے بروئے مشاہدہ لایا جائے کہ دل و دماغ اپنی انبساطی محرکات سے لُطف اندوز

اُردو شاعری میں قدیم ہو کہ جدید یہ کیفیت بدرجہ اتم کلامِ غالب کو میسّر آئی ہے کہ اس کے کلام کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں اور ابھی مزید کافی گنجائش ہے کہ بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں۔

اس وقت جو غالب پر حکومت کے تعاون سے کام ہو رہا ہے بہت ممکن ہے کہ اہلِ شعور طبقہ کی مساعی مشکورہ سے اور بہت سے گوشے واضح

اس خصوص پر یہ اشہبِ قلم کی گامزنی اُردو ادب کے لئے بہت سے فوائد کے حصول کی نشاندہی کر رہی ہے۔ تکمیلِ ادب کیلئے اُردو نظم و نثر کے جن فنکاروں کے تفصیلی تعارفی خاکے لازمی سمجھے گئے ہیں اُن میں غالب کی شخصیت کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔

ہمیں بھی حُسن اتفاقات سے اِس شخصیت کے متعلق مختلف پہلوؤں سے بحث و تمحیص کے اندازوں کا کافی موقعہ ملا ہے جو بحمد اللہ آج سطحِ دماغ سے صفحۂ قرطاس پر ہدیۂ اہلِ ادب ہیں۔

یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ اجزائے منتشرہ برسوں کی دماغی محنت کی شیرازہ بندی پر اُردو کے خزینۂ ادب میں اک انمول اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور آج کی تحریکِ غالب اس کی محرک ہے کہ اس "سیرِ غالب" کے مطالعہ پر آپ غالب کے بارے میں جو کچھ بھی پڑھینگے تو آپ کو اِس کی قدر و منزلت کا اندازہ ہو سکے گا کہ واقعی غالب ایسے ہی تھے۔ اور یہ کمالِ اعجاز ہر کسی کو میسّر نہیں ہے۔ غالبؔ

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مِٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

قومی یکجہتی کا علمبردار عملی زندگی میں غالب تھا۔ اسی لئے غالب کا تعارف وقت کی اہم پکار ہے اور شاعر اس اعزاز کا بجا مستحق ہے بشرطیکہ شتر گربگی سے کام نہ لیا جائے اور "تصویرِ غالب" کے صحیح خدوخال ہر ممکنہ تنوع سے اصلیت کے روپ میں پیش ہوں تو یہ خدمتِ حُسنِ ادب پر چار چاند لگائے گی اور قدسی یہ ترانۂ غالب نغمائینگے:۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

ورنہ پھر یہ بیجا ستائش کہ "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ" یہ ادبی دوڑ دھوپ کسی تاریخی افادیت کی حامل نہ ہو سکے گی اور حکومت کا اشتراکِ عمل بھی محض کور سوادی کا متحمل ہو کر رہ جائے گا۔

چنانچہ حال میں لکھنؤ میں اسی "یادگارِ غالب" کے تعارفی جلسہ کا بیان اس عنوان سے "صدق" مورخہ ۸ رنومبر میں آیا ہے "کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا" کہ اکتوبر کے چوتھے ہفتہ یومِ غالب کے سلسلے میں لکھنؤ میں جو جلسہ منعقد ہوا جس میں صدر جلسہ مرکزی وزیر تھے اور شریک جلسہ مرکز اور صوبہ کے عمائدین بڑی اس سے جو ذمہ دارانہ تقریریں ہوئیں ان میں بار بار یہ کہا گیا کہ

۱۔ "غالب اردو فارسی کے ایک بڑے شاعر نہیں بلکہ ایک آفاقی شاعر تھے۔

۲۔ غالب جنگ آزادی کے مجاہد تھے اور برطانیہ کے مخالف اور سلطنتِ مغلیہ کے قصیدہ خواں رہے"!

پہلی بات کی تو کسی ادبی فنکاری پر توجیہ ہو سکتی ہے وہ بھی جبکہ اس اردو کی اہمیت کا برادرانِ وطن اعلان اور اقرار کریں جس کا اس جنگ آزادی میں نمایاں کردار رہا ہے اور خود غالب کی شہرۂ آفاق شخصیت اسی اردو کی بدولت مسلّم ہے۔ لیکن دوسری بات تو ایسی کھلی تاریخی بغاوت ہے کہ جس کا انتساب اہلِ علم کی طرف کسی رخ سے بھی سندِ جواز کا حامل نہیں۔ غالب سلطان ٹیپو کے درباری شاعر ہوتے تو خیر یہ ممکن تھا یا پھر سید احمد شہید اور محدث

اسمٰعیل شہید کے ساتھ بالاکوٹ میں انگریزوں سے جہاد کرتے ہوئے مرتبۂ شہادت پایا ہوتا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں کے نمک خوار پینشن یافتہ بہی خواہ تھے جنکے ۲۵ فارسی قصیدے انگریز فرنگیوں کی شان میں ہیں جبکہ وہ بھی سلاطین مغلیہ کے لئے نہیں۔

غرضکہ کسی کی تعریف و توصیف میں وہی اوصاف لانے چاہئیں جو موصوف میں ہوں۔

انگریزوں کی مخالفت اور جنگ آزادی کا جہاد حسرت موہانی، ظفر علیخاں اور رئیس الاحرار محمد علی جوہر کے یہاں تو ہو سکتا ہے۔

اقبال، اکبر، حالی کے یہاں بھی نہیں ہے چہ جائیکہ بیچارے غالب کے یہاں۔ یہ آج اک دستور سا ہو گیا ہے کہ خواہ مخواہ کسی کی مدح و ستائش میں یہ جنگ آزادی کے سرخاب کے پر اور برٹش بہادر کی مخالفت کا پرچم لگا دیا جائے چاہے موصوف اپنے اسوقت کے برٹش نوازی کے ٹوڈی رہے ہوں گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی جب "یوم حسرت" قوم منائے یہ چیزیں اور ان سے بھی بہت کچھ زیادہ وہاں برمحل ہونگی۔

اہل شعور طبقہ سے بصد ادب یہ التماس ہے کہ ایسے مواقع بہت کم مغتنمات سے ہوتے ہیں فرصتِ وقت سے قرار واقعی استفادہ حاصل کیا جائے کہ ضمناً یہ ہماری زبان کی ہی اہم خدمت سے وابستہ ہے۔ فقط حدادب

بندۂ اخلاص

ابو الحسنات تبدل فاروقی صدر

دار الحسنات احسن المطابع شاہ ولایت سہارنپور

فہرست عنوانات

دیباچہ از مؤلف

ایسے دور میں جبکہ ہمارے مشترک ہندو مسلم کلچر اور ادب کی حامل اُردو زبان سے اس کے اصل موقف اور اس کے صحیح مقام کے مطابق کسی قسم کا بھی سلوک اور رواداری کا برتاؤ روا نہ رکھا گیا ہو۔ ایسے ناہموار دور اور ایسی ناسازگار فضا میں غالب مرحوم کی خوش بختی کہ خدا جانے ان کی وہ کونسی ایسی پُرخلوص ادا ہوگی جو قدرتِ فیاض کو بھائی ہوگی کہ اس اُردو کے سلطانِ ادب کا حکومت اور برادرانِ وطن ادبی اور شخصی تعارف ملک و ملّت کے لئے پیش کر رہے ہیں۔

میسور گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیمات میں علوم شرقیہ کے صدر شعبہ کی حیثیت سے اس فدویٔ اخلاص کو اُنتالیس سال خدمتِ علم و ادب کا جو موقعہ ملا اسکا لازمی نتیجہ تھا کہ غالبؔ کے بارے میں جو تحقیقی خصوصیات پوچھے گئے وہ اپنی جس شانِ انفرادیت کے حامل تھے ان کا خصوصی تعارف اہلِ ادب سے بُلالزمی تھا جہاں وہ اساتذہ اور تلامذہ کی حد تک رہا۔

کُل شئ مرھونٌ باوقاتہا، اب کہ غالب جیسی شہکارِ فن نادر شخصیت کا تعارف ملک و قوم کے پیش نظر ہے۔ ہماری طرف سے بھی یہ تحقیقی مقالات کا مجموعہ "سیر غالب" کے نام سے جملہ عوام و خواص کے لئے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہے۔

اس ہمارے چہل سالہ ادبی ذوق کی کائنات کے حاصل میں جو سیر حاصل ادبی نادرات آپ کے مطالعہ میں آئینگے وہ یقیناً ادب اور اہلِ ادب کے

اعزاز کے بجا مستحق ہونگے۔

اہلِ بصیرت باور کرینگے کہ غالب کی ندرتِ فکر واقعی اک نرالی شان کی مالک تھی جس کو ہم "سیرِ غالب" میں جملہ اہلِ ادب کی طرف سے قرار واقعی بجا طور پر فخر کے ساتھ ملک و ملت اور قوم و وطن کے لئے پیش کر رہے ہیں۔

"قومی یکجہتی" کا حقیقی موقف وہی ہے جو قومیانہ ہونے پر بین الاقوامی پوزیشن کا حقدار ہو۔ "سیرِ غالب" کا مطالعہ یہ حقیقت آپ پر مبرہن کر دیگا۔

فقط حدادب

ابوالحسنات بیدل فاروقی صدر دار الحسنات احسن المطب شاہ ولایت سہارنپور

(سابق صدر شعبۂ علوم شرقیہ میسور گورنمنٹ)

قطعہ تاریخ "سیرِ غالب" بر موقعہ غالب اکیڈمی ۲۲ فروری سنہ ۶۹ء بہ جشن صد سالہ

طرزِ ادا میں غالب، جب ہے بیانِ غالب
اہلِ سخن میں یکتا، کیوں ہو نہ شانِ غالب
غالب کی ہر زمیں ہیں، الہامی شاعری ہے
صد رشکِ خلدِ رضواں، ہے بوستانِ غالب
بیدل ہے "سیرِ غالب" ۔ صورِ جہانِ غالب

۸۸ ۱۳ ھ

(۱) معلومات عامہ۔ مختصر سوانح حیات

۱۔ پیدائش اور نام اسد اللہ بیگ خان نام، مرزا نوشہ عرف، نجم الدولہ، دبیر الملک، نظامِ جنگ شاہی خطاب۔ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ سہ گھڑی پیش از طلوعِ صبح، مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو اکبر آباد آگرہ میں پیدا ہوئے۔ خود غالب نے اپنی تاریخِ پیدائش "غریب" اور "شورشِ شوق" نکالی ہے۔ یہ دونوں مادّے ایسے ہیں کہ ان سے غالب کی زندگی کا عکس اور اس کی سیرت کی عکاسی، محاکاتی آئینہ ہے۔ نام، عرف اور خطاب وغیرہ کے متعلق غالب کی اُردو فارسی تحریروں میں کافی تصریحات ملتی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ نام کے بعد اور تخلص سے پہلے "بہادر" کا لفظ لکھا جائے۔ بہادر کا لفظ غالب کو بہت پسند تھا۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یا تو اُن کو "نواب" لکھا جائے یا "مرزا"۔ غالب نے خود اپنا عرف "مرزا نوشہ" بتایا ہے لیکن یہ عرف ان کو اتنا پسند نہ تھا جوانی میں پسند آگیا ہو گا۔ اسکی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کے باپ عبداللہ بیگ خاں کا عرف "مرزا دولہ" تھا۔ باپ بیٹے کے عرف میں اس تشابہ پر کہ وہی دولہ وہی نوشہ یہ عرف غالب کو ناپسند تھا۔

تخلص ابتدا میں غالب نے اُردو شاعری میں اسدؔ تخلص اختیار کیا تھا، فارسی میں شعر کہنے لگے تو غالبؔ تخلص رکھ لیا پھر اُردو میں بھی یہی رائج ہو گیا لیکن اُردو میں غالب نے اس کی پابندی نہیں کی اسدؔ بھی لاتے رہے اور اسد اللہ خاں بھی لے آتے۔ کہتے ہیں کہ ایک اور شخص اسدؔ کے تخلص سے شعر کہا کرتا تھا جسکا نام "میر امانی"

تھا لوگوں نے اسکے کسی ایک شعر کو غالب کا سمجھکر یا بطور مزاح، مذاقاً غالب کے سامنے پیش کیا تو یہ چیں بجبیں ہو کر بولے کہ "یہ کس حرامزادے نے کہا ہے یہ میر امانی کا کہا ہوا ہوگا میرا کلام ایسا بیہودہ نہیں ہو سکتا، میں نے فقط شروع میں دو چار برس اسدؔ تخلص کیا ہے اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پر ہزار لعنت"۔

غلام رسول مہر کہتے ہیں کہ "یہ جو تخلص بدلنے کی وجہ بتائی جاتی ہے اور اسکی ابتدا اس حکایت سے کی جاتی ہے یہ غلط ہے فقط آزاد نے آبحیات میں یہ بات لکھی ہے اس کی کوئی سند نہیں، اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس واقعے سے پہلے بھی آپ اُردو غزلوں میں غالبؔ تخلص لاتے تھے"۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ پہلے آپ اسدؔ تخلص کرتے تھے لیکن حضرت علی رضؓ کا لقب "اسد اللہ الغالب" ہے اس لئے احتراماً آگے چلکر غالب ہی تخلص کر لیا کہ آپ شیعیت کی طرف مائل تھے۔ میرے خیال میں یہ ممکن ہے کہ بالکل ہی ایامِ طفولیت میں لاشعوری پر اسدؔ کا استعمال رہا ہو کچھ شعور کے بعد، غالبؔ کا زیادہ اور اسدؔ کا گاہے بگاہے ورنہ غالب کی افتادِ طبع کے پیش نظر واقعہ کو اس کی خصوصی نوعیت کے تحت ماننا ہی پڑتا ہے۔

حسب و نسب اور خاندان غالب قوم کے ترک تھے بار بار دعویٰ کرتے تھے کہ میرا سلسلۂ نسب فریدوں کے بیٹے توران سے جا کر ملتا ہے پھر آپنے یہ بھی لکھا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ آپ کا گھرانا کیسے تباہ و برباد ہوتا ہندوستان پہنچا۔ اتنی بات ضرور ہے کہ آپکا خاندان بلند درجہ تھا اور ان کے آباؤ اجداد جنگجو سپاہی اور بڑے مرد میدان بہادر کہلاتے تھے۔ اور اس خاندان کو "ایبک ترک" کہتے تھے جس پر غالبؔ کو بڑا ناز تھا۔

غالب کے دادا محمد شاہ کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان آئے تھے۔ شاہ عالم نے ان کو جاگیر دی تھی۔

غالبؔ کے والد | غالبؔ کے والد عبداللہ بیگ خاں دِلّی ہی میں پیدا ہوئے تھے ان کا نکاح آگرہ کے ایک رئیس کے یہاں ہوا اور وہ وہیں سسرال میں رہتے تھے۔

غالبؔ کی والدہ | غالب کی والدہ کا نام عزت النسا بیگم تھا۔ غالبؔ نے خود لکھا ہے کہ وہ پڑھی لکھی تھیں۔ نانا خواجہ غلام حسین خاں کمیندان تھے جو آگرہ کے عمائدین سے تھے اور جاگیردار تھے۔ غالب اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ وہ بڑے مالدار تھے یہاں تک کہ ان کے ماتحت زمینداروں کو دس دس ہزار روپیہ لگان ادا کرنے والے بتایا ہے۔

مزید والد کے حالات | غالبؔ کے والد پہلے آگرہ دربار میں رہے پھر لکھنؤ میں آصف الدولہ کے پاس ملازم ہوئے پھر حیدرآباد گئے وہاں سے پھر آگرہ آئے وہاں آپکی شادی ہوگئی تھی پھر الور کی فوج میں داخل ہوگئے۔ عمر کا آخری زمانہ الور دربار میں گذرا چنانچہ اسی فوج میں ایک زمیندار کا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے راج گڈھ کے پاس۔ ان کی ایک بیٹی تھی غالب کی بڑی بہن اور دو بیٹے، ایک غالب دوسرے میرزا یوسف بیگ خاں۔ الور کے راجہ نے بچوں کی پرورش کے لئے کچھ جاگیر اور وظیفہ بھی دے رکھا تھا۔ غالبؔ نے الور کے راجہ کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا ہے اسمیں کہا ہے ؎

کافی بود مشاہدہ شاہد ضرورنیست
درخاک راج گڈھ پدرم را بود مزار

غالبؔ کے چچا | اسی طرح غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں کا نکاح لوہارو کے

شاہی خاندان میں ہوا تھا۔ مرہٹہ اور انگریز دربار میں وہ بڑے مرتبوں پر مامور رہے
جاگیر پائی ان کے مرنے پر ان کے وارثوں کو پنشن ملی۔

غالبؔ کا خاندانی وقار، افتخار | غالب کو اپنے نسب پر بڑا ناز تھا، وہ
ہمیشہ ایرانی، تورانی، سلجوقی اور شاہی خاندان سے ہونے پر خود کو بڑا سمجھتے تھے۔
فارسی میں لکھتے ہیں ؎

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم — لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمیں — بہ سترگانِ قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعتِ اتراک — در تمامی ز ماہ دہ چندیم

ایک اور جگہ لکھتے ہیں ؎

بلند پایہ مرا، گرچہ من سخن سنجم — ولیک پیشۂ آباء بعالمِ اسباب
سپہگری بروز فراسیاب تا پدرم — ہماں طریقۂ اسلاف داشتند اعقاب

اُردو میں فرماتے ہیں ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

غرضکہ غالب کے ان دعوؤں کو حرفاً حرفاً بلا کم و کاست درست سمجھنا چاہیئے۔

بچپن اور تعلیم | اگرچہ اوائل عمر ہی میں آگرہ چھوڑ دی آپ آبسے تھے۔
پھر بھی اپنے وطن کی محبت دل میں ہمیشہ موجزن رہی۔ پانچ سال کی عمر میں
باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ آٹھ برس کی عمر میں چچا بھی دنیا سے رخصت ہوئے
باپ کے انتقال کے بعد تین برس انھیں کے یہاں تربیت پائی پھر وہ بھی گزر گئے
تو ننھیال میں رہنے لگے۔ اس طرح آپ کا بچپن اور لڑکپن آگرہ میں گزرا۔ یہاں

ایک بزرگ شیخ محمد معظم سے تعلیم حاصل کی اور کہتے ہیں کہ نظیر اکبر آبادی سے بھی کچھ پڑھا۔ ممکن ہے کہ درسی دینی تعلیم مولوی معظم سے، اور اُردو فارسی ادبیات شعر و شاعری نظیر اکبر آبادی سے کہ اسوقت کا یہی تمدن تھا اور یہی ماحول اور یہی رواج تھا۔

اسی زمانہ میں ایک ایرانی مجتہد ملّا عبدالصمد نامی آگرہ آیا اور دو سال غالب کے گھر رہا۔ وہ پارسی نومسلم تھا غالب نے فارسی کی انتہائی تعلیم اس سے حاصل کی۔ اسی لئے ان کو اپنی فارسی دانی پر بڑا ناز تھا لیکن حال یہ ہے کہ شاگردی کے بارے میں خود غالب کے تحریری بیانات میں اختلاف اور تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عبدالصمد واقعی ایک شخص تھا۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ میں صرف خدا کا شاگرد ہوں، عبدالصمد فرضی نام ہے جو لوگوں کا منہ بند کرنے کے لئے میں نے گھڑ لیا ہے نہ وہ میرے یہاں آیا اور نہ میں نے اس سے کچھ پڑھا۔ اس حرکت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو دوسرا بیان ظریفانہ ہے یا پھر پہلا بیان غلط ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ فارسی زبان اور ادب میں غالب کسی کے شاگرد نہ تھے۔ عبدالصمد سے تلمذ اسوقت ثابت کیا تھا جب کچھ فارسی محاوروں کے معنوں کے بارے میں آپنے نواب صاحب سے اختلاف کیا تھا۔ نواب صاحب ہندوستانی لغات نویسوں کے معنوں کو صحیح سمجھتے تھے اور غالب ہندوستان کے سب فارسی لغات نویسوں کو غیر معتبر ٹھہراتے تھے، کہتے تھے کہ "ٹوٹے کھوری می آید" یہ ممکن ہے کہ غالب نے اپنے ایرانی نومسلم پارسی مہمان عبدالصمد سے دو برس تک فارسی میں گفتگو کی ہو اور شعر و شاعری، تصوف فلسفہ پر بحث رہی ہو اگرچہ نسبت تلمذ کیلئے "اینقدر ہم

کفایت دارد و عدم نسبت ہم درست" اد ردوا باشد۔ تاہم اس مغتنم موقعہ سے غالب نے ضرور اپنی خداداد فطری صلاحیت پر اپنی باریک بینی کے جوہر استعداد کو کمال پر لاجانے پہنچایا ہوگا لیکن اس سے فارسی زبان سیکھنے کا ادّعا غلط ہی معلوم ہوتا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی سچ ہے کہ غالب کو اپنی فارسی دانی پر بجا ناز اور جائز فخر تھا۔ اور فارسی زبان و ادب پر بھی کمال حاصل تھا۔

اگرچہ لہو و لعب امیرانہ زندگی کا اسوقت اک خاص اسلوبِ معاش تھا بقول اقبال تقدیر امم کیا ہو ع تلوار و سناں اول، طنبور و رباب آخر۔ اسکے باوجود ان کے یہاں رسم مکتب چار سال چار ماہ چار دن پر اک لازمی شئی تھی اور اس سے بیشتر ہی ماں کی گودہی باپ کی انگلی سے بہت پہلے بہت کچھ پڑھا دیتی تھی۔ ایسے غالب کی والدہ جو اک علمی گھرانے کی ہی نہ تھیں بلکہ جن کے یہاں شریعت کے ساتھ ساتھ طریقت کی خاندانی روحانی تعلیم بھی تھی۔ غالب نے اپنی ذہانت پر وہ سب کچھ جو مکتبوں میں پڑھایا پڑھوایا جاتا تھا گھر میں ہی پڑھ لیا تھا۔ اب مولوی محمد معظم کیلئے غالب جہاں تلمیذ تھے وہیں استاد کی حیثیت سے بھی زاویہ نگاہ بنے ہوئے تھے۔ استاد سے اثر پذیر ہونے کے ساتھ خود استاد پر بھی اثر انداز تھے کہ وہ غالب کی انوکھی پوچھ گچھ پر بہت کچھ اپنے اس ہونہار شاگرد سے حاصل کرتے تھے۔ اور مکتب میں الف، ب، ت کی جگہ شعر و شاعری کی ابجد اور رومانی، وجدانی فلسفے کی ہفت خوانی بھی طے ہوتی تھی۔ ماں کی گودی کی تعلیم نے غالب کو مکتبوں کی بوریہ نشینی سے بے نیاز کر دیا تھا یہ وہاں جاتے تو ؎

بلبلیں نالے مرے سنکر غزلخواں ہوگئیں　　میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا

آداب زندگی کے مطالبے استاد سے رہتے۔ گھر آتے تو اوقات فرصت میں وہی پتنگ، کبوتر، بٹیر، مرغ بازی وغیرہ اور جتنی بازیاں مروج تھیں سبھی سے شوق فرماتے۔ ذرا اور کچھ ہوشیار ہوئے تو شطرنج بھی ان مشاغل میں شعر و شاعری کے ساتھ شامل ہو گیا۔ گھر کی اس فارغ البالی نے اسپر اور چار چاند لگادئے یہ انداز معاشرت آگرہ کی پوری زندگی میں رہا اور اسی کے ساتھ وقت کے علماء مجتہدین سے بھی خاندانی آداب معاشرت پر علمی مراسم رہے جو ہر کس و ناکس کو میسر نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ہرمز نامی مجوسی جو نومسلم ہونے پر ملا عبد الصمد ہو گیا تھا اک ایرانی مجتہد کا مقام رکھتا تھا مگر "الناس علیٰ دین ملوکہم" ایران دربار ان دِنوں بھی شیعہ ہی تھا وہاں کے اکثر اہلِ علم شیعہ ہی تھے یہ نومسلم بیچارہ کیسے شیعیت سے بچ سکتا اور اپنا الگ کوئی دوسرا زاویۂ فکر بنا سکتا تھا۔ اِسی تصویر کا یہ دوسرا رُخ ہے کہ بچپن کا معصوم دماغ بہت جلد پہلے اثرات قبول کر لیتا ہے چنانچہ الصحبۃ المؤثر باوجود صوفیانہ گھرانے کے جس کے لئے ٹھیٹ سُنیّت لازمی ہے غالب پر شیعیت اثر انداز رہی۔ ایک تمثیل ملاحظہ ہو:۔

مامون کی ماں فارسی النسل باندی تھی یہ ہارون الرشید ہاشمی کا بیٹا جب خلیفہ ہوا تو ایرانی ادیبوں شاعروں کو بھی بغداد دار السلام کے دربار میں وہی مقام میسر آیا جو خالص عرب کے ادیبوں کو حاصل تھا اور اہلِ بیت کی محبت کا الزام بھی مامون پر اسی پس منظری کو بتاتا ہے کہ حق خلافت سے ہی انکے حق میں دستبردار ہونے کو بیٹھا تھا یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُستاد کا درجہ تربیتاً پدر پر فضل ہی ہے۔ سکندر ارسطو کو باپ پر اسی وجہ سے ترجیح دیتا تھا۔

غرضکہ غالب کی منفرد شخصیت کا بچپنا اک پیرِ نابالغ کی گراوٹ اور فرسٹ لئے ہوئے تھا جسکے وجوہ خاص حالات کے تقاضوں کے تحت یہی تھے کہ غالب کی پانچ سال کی عمر میں باپ کا انتقال ہو گیا۔ آٹھ نو برس کی عمر میں چچا کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اسکے باوجود غالب کا بچپن بڑی امیری میں گزرا کیونکہ ددھیال اور ننھیال دونوں طرف کی جاگیریں اور پینشن وغیرہ موجود تھیں۔ اگر غالب نے اپنا بچپن امیرانہ ٹھاٹ سے گزارا ہو تو اس کے اسباب بھی فراہم تھے۔ شراب کی عادت بھی ممکن ہے اسی زمانہ میں پڑی ہو جو مرتے تک نہ چھوٹی۔

غالب کی تعلیم کے بارے میں اگرچہ تفصیلی حالات معلوم نہیں البتہ حالی نے "یادگارِ غالب" میں لکھا ہے کہ "آپ آگرہ کے مشہور معلم شیخ معظم سے پڑھتے رہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ نظیر اکبر آبادی نے بھی غالب کو پڑھایا ہے۔ لیکن اسمیں اختلاف ہے۔ ان کے خطوط سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انکی تعلیم فارسی میں سب سے بڑا حصہ ایک نو مسلم ایرانی پارسی کا ہے جس کا نام پہلے ہرمز تھا پھر عبدالصمد رکھا گیا۔ اسے فارسی اور عربی کا متبحر عالم بتایا جاتا ہے۔ پھرتے پھراتے یہ شخص آگرہ آ گیا تھا غالب نے اسے دو سال اپنے یہاں مہمان رکھا۔ غالب کی ذہانت کا اسپر اتنا اثر پڑا کہ بعد میں بھی مدتوں تک اس نے غالب سے خط و کتابت جاری رکھی اور صرف دو سال کی مدت میں اس شخص سے غالب نے بہت کچھ حاصل کر لیا۔ لیکن ایک اور خط میں غالب خود اعتراف کرتے ہیں کہ آپنے یہ کہانی مخالفوں کو نیچا دکھانے کیلئے گھڑی تھی کہ لوگ "بے اُستادہ نہ کہیں"۔

ہمارے خیال میں اسکی بھی یہی تطبیق ہو سکتی ہے کہ غالب کی طفلی کے

سبب لائق سے لائق استاد کا ہونا نہ ہونا برابر تو یہ کہنا بھی درست کہ غالب کا کوئی استاد
نہ تھا۔ وہ ملا عبدالصمد ہو یا اور کوئی ہو۔ اور نیز غالب کی مافوق الفطرت ذہانت کے
سبب یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ غالب کی عمر کم سنی کے سبب اگرچہ کسب علوم کی
نہ تھی مگر غالب نے سب کچھ نہ سہی بہت کچھ اسی کم سنی کی اس مختصر سی مدت میں اس
ایرانی سے حاصل کر لیا تھا تو غالب اگر عبدالصمد کو استاد کہے تو اسے یہ بھی درست ہے
اور نہ کہے تو یہ بھی اسے زیبا ہے کہ غالب کے بچپنے کی یہ صحبت اک مہمانداری تھی
استادی شاگردی نہ تھی۔ یہ اور بات ہے کہ غالب نادانستہ لاشعوری میں اس علمی
صحبت سے مستفید ہوئے۔ کیونکہ اس صحبت کا رنگ مکالمانہ مباحثانہ محققانہ اور
کبھی مناظرانہ رہا ہے تو پھر یہ شاگردی کہاں کی۔ جب ملا عبدالصمد کو غالب کے
اعتراضات کا جواب جو بصورت استفسار ہی سہی خوش فہمی میں خوش ہو کر بے خود
ہو کر دینا پڑتا تھا کہ کیسا ذہین لڑکا ہے اور تا دیر یہ مجتہد غالب کا معتقد رہا۔ چنانچہ
اسی طرز تخاطب میں غالب نے اسی عبدالصمد سے شاعری کے اصول بھی سیکھے اور شاعری
میں پھر کسی اور سے تلمذ نہیں کیا۔ آپ سچ مچ "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" کے مصداق تھے
لیکن سب سے زیادہ فائدہ آپ کو خود اپنے مطالعہ سے ہوا۔ کتب بینی کا شوق بحد کمال،
سرحد جنوں تک تھا مطالعہ بہت کرتے تھے بہت جلد مطالب سمجھ لیتے۔ اس پر حافظہ
غضب کا جو اتنا تیز تھا کہ ایک ہی نظر میں یاد ہو جاتا۔ تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ
آپکو فارسی زبان، اسکی صرف و نحو اور اس کی تاریخ اسکے محاوروں پر مکمل عبور حاصل
تھا اور یہ کہ آپنے اساتذہ کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔ اسکے سوا آپکو عربی
بھی بقدر کفایت آتی تھی۔ تصوف منطق اور نجوم سے کافی آگاہی تھی۔ خطوط میں

بعض اشارے ایسے بھی ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو طب سے بھی آگاہی تھی۔ خطوط میں آپ نے نسخے بھی بتائے ہیں۔

غالبؔ کی تعلیم کا پس منظر ظاہر ہے کہ غالب کا لاشعوری دور آگرہ میں گذرا اور وہیں مُلا عبدالصمد کی دو سالہ صحبت اور نظیر اکبرآبادی سے مشقِ سخن اور مولوی معظم کی مکتب کی بوریہ نشینی رہی۔

یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ ایک مہذب علمی خاندان کے کسی بچہ کی رسم مکتب نہ ہو؟ یہ تعلیم لاکھ بےقاعدہ سہی مگر اس کے تمدنی نقوش کا ایک ذہین دماغ پر اثرانداز نہ ہونا ناممکنات سے ہے۔ حسب تقاضائے وقت ان مکتبوں میں بھی شعروشاعری کا رواج تھا۔ ذہین بچوں کا ان صحبتوں میں اہم کردار ہوتا۔ وہ مکتب کے خلیفہ، مانیٹر نائب اُستاد ہوتے۔ اُستاد کی غیر موجودگی میں یہی سب کچھ ہوتے۔ یہ فضا ان مکاتیب کی ہمارے بچپنے تک رہی پھر افرنگی اقتدار میں مفقود ہو گئی۔

چنانچہ سعداللہ خاں کی طفلِ مکتبی کی ذہانت کا واقعہ مشہور ہے کہ دورِ شاہجہانی میں مغل دربار سے ایرانی حکمرانوں نے یہ مزاحاً پوچھا کہ تم شاہِ ہند خود کو شاہجہاں کیوں لکھتے ہو۔ بادشاہ نے علمائے دربار سے اس کی توجیہ چاہی اور یہ چیز دوسرے مکاتیب کے اُستادوں تک بھی پہنچی، سبھوں نے دلچسپی لی، سبھی اپنی دماغی صناعی پر کھوج میں پڑے۔ سعداللہ کے استاد بھی مشقِ فکر میں تھے اور شریکِ شغل سبھی ذہین بچے تھے کہ سعداللہ بولے "جہان کے عدد بھی ۵۹ اور ہند کے بھی عدد یہی ہیں تو شاہِ ہند کو شاہجہاں کہنے کا حق ہے۔" استاد یہ سنکر پھڑک اٹھے اور اپنی مشق اجتہاد پھاڑ ڈالی اور سیدھے دربار پہنچے کہ میری مکتب کے ایک بچّے نے یہ مہم سر کی ہے۔

شاہ بھی یہ سُن کر بیحد محظوظ ہوئے۔ بس اسی پر رسمی تعلیم ختم ہوئی اور سعد اللہ کرسیٔ وزارت پر بٹھا دئے گئے۔ اس قسم کے واقعے تاریخ میں ہزاروں ہیں۔ دُور نہ جائیے شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں :۔

ع   اَبَا هِنْدٍ فلا تعجل علينا۔ الخ" اس شعر نے ہماری کایا پلٹ کر دی۔ ہم تو مسجد میں مولوی صاحب سے عربی پڑھتے تھے کہ دلّی چاندنی چوک میں ایک پادری لیکچر دے رہا تھا۔ میں اسقدر چھوٹا تھا کہ لوگوں کی ٹانگوں میں سے گھُس کر اندر پہنچ گیا پادری نے یونہی تعجب سے پوچھا! "لڑکے کیا پڑھتے ہو؟" میں نے کہا سبعہ معلقہ، اس نے حیران ہو کر اس شعر کے معنی پوچھے ہم نے بتا دئے۔ اس نے اس کمسنی کی ذہانت اور لیاقت سے متاثر ہو کر نام اور پتہ پوچھ لیا۔ ہم نے مسجد اور مولوی صاحب کا نام لے دیا۔ تو دوسرے ہی دن وظیفہ کے ساتھ ہمارا بوریا بستہ مسجد سے کالج کی اعلیٰ تعلیم کے لئے اٹھ گیا پھر سبھی کچھ اقتدار آیا سو آیا حتیٰ کہ اس مسجد کی قلندری کے زمانہ میں جہاں کسی امیر گھر میں ہمارا کھانا بحق طالب علمی مقرر تھا ہم جب کھانا لینے وہاں جاتے تو ان کی جو صاحبزادی ہم سے مسالہ پسواتی اس خیراتی کھانے کی دلیل میں اور ایک اپنی امارت کا فخر اور غرور اس اپنی خاندانی حاتمی پر جتاتی۔ وہی لڑکی جب ہم کچھ بن گئے ہماری رفیقۂ حیات کہلائی اور وہ پچھلا دور اک ڈرامائی کیفیت کبھی کبھی اپنی دہرا دیتا اور لطف دو بالا کر دیتا۔

غرضکہ ہمیشہ اس قسم کی وہبی تعلیم کے فطری بچے ہر دور میں پیدا ہوتے ہیں ترقی کے مادی اسباب ملے تو کچھ سے کچھ بنجاتے ہیں ورنہ ہزاروں کلیاں بن کھلے مرجھا جاتی ہیں۔ میر علیہ الرحمہ نے بھی غالب کی اسی ذہانت پر کہا تھا کہ "یہ بچہ اگر

تربیت ملی تو کچھ سے کچھ ہو جائے گا ورنہ مہمل گو بن جائے گا۔" میر درویش کی بات سو فیصد پوری اتری کہ غالب کو مادی روایتی تربیت کے فقدان پر آخر مہمل گو کہا گیا اور فطری ذہانت کی خداداد صلاحیت کی رہبری پر "جگت گرو" اور استادِ کامل بھی مانا گیا اور مانا جا رہا ہے۔

غرضکہ ابتدائی تعلیم کا ہی اک اہم ترمرحلہ ہوتا ہے کہ صاف ذہنوں پر اچھے نقوش مرتسم ہو جاتے ہیں جو عمر کے آخر تک ان مٹ رہتے ہیں۔ غالب نے اپنی فطری صلاحیت کو بالکل ایک اچھے اسلوب اور عمدہ ندرت کے ساتھ اپنایا اور بلا کسی کی مرہونیت کے وہ مقام اپنے لئے انتخاب کیا کہ شاید شاعر نے یہ شعر غالب کے ہی حق میں کہا ہو ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!

ب (شادی)

غالب کی خانگی زندگی اور خاندانی حالات | نواب الٰہی بخش خاں معروف کی چھوٹی بیٹی امراؤ بیگم سے ۱۲۲۵ھ میں تیرہ برس کی عمر میں اُس لوہارو کے شاہی خاندان میں غالب کی شادی ہوئی جہاں اُن کے چچا کا بھی نکاح ہوا تھا۔ جب غالب کے سسرے دہلی میں رہنے لگے تو شادی کے بعد دہلی میں غالب کی آمد و رفت اور زیادہ ہو گئی اور ۱۷ برس کی عمر میں تو یہ آگرہ چھوڑ دلی میں ہی آ رہے عمر بھر کوئی ذاتی مکان نہ بنوایا۔ مختلف محلوں میں جامع مسجد کے ارد گرد ہمیشہ کرایہ کے گھروں میں رہا کئے۔ آخر میں مسجد کے پیچھے ایک گھر میں رہے جسکے بارے میں لکھتے ہیں ؎

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

یعنی وہی کرایہ کا۔ یہ گھر آج بھی بلیماران میں غالب کے نام سے موسوم ہے۔

خسر | غالب کے خسر فیروز پور اور لوہارو کے نواب کے چھوٹے بھائی تھے۔ ساری عمر عبادت اور گوشہ نشینی میں بسر کی تھی۔ اچھے شاعر تھے، شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ ان کی قبر، غالب کی قبر کے پاس ہی نظام الدین اولیاء کے احاطہ میں ہے۔ آزاد نے جہاں ذوق کو عمداً اور قصداً غالب پر فوقیت دینے کی نامساعدت بخش ناکام کوشش کی ہے وہاں معروف کو بھی ذوق کا شاگرد بتایا ہے جو سراسر غلط ہے اور نری تہمت ہے اور ہو بھی تو اس میں غالب کی ہیٹی ہے نہ ذوق کی برتری بشرطیکہ تاریخی ثبوت ہو جو یہاں یکسر بالکل مفقود ہے۔

لوہارو کا خاندان | یہ ریاست امراؤ بیگم کے باپ دادا نے جانبازی کے صلے میں پائی تھی۔ دراصل یہ خاندان ترکستانی تھا، انگریزوں نے خوش ہو کر اس خاندان کو فیروز پور کی جاگیر دی تھی اور لوہارو انھوں نے خرید لیا تھا۔ اس خاندان میں شعر و سخن کا ذوق فارسی اور اردو دونوں میں بہت زیادہ رہا اور غالب کی شادی کے بعد اسکے افراد میں تخت و حکومت کے لئے بڑا جھگڑا رہا۔ یہاں تک کہ اسی سلسلے میں ایک دعویدار نے انگریز افسر ہی کو قتل کرا دیا جس کے بدلے اُسے پھانسی دیدی گئی۔ اس رشتہ داری کی بنا پر غالب کو جو پنشن ملنی چاہیئے تھی اسکے بارے میں بھی غالب کو بہت جھگڑنا پڑا۔

بیوی سے تعلقات | امراؤ بیگم عمر میں غالب سے دو سال چھوٹی تھیں۔ شادی کے وقت گیارہ برس کی عمر تھی۔ ان کے بھائی علی بخش خاں رنجور بھی اچھے

شاعر تھے۔ بہنوئی سے ان کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ انہیں کے کہنے پر غالب نے اپنی فارسی نثر کی مشہور کتاب "پنج آہنگ" لکھی۔ انکو وفات تک پنشن ملتی رہی۔

غالب نے شادی کو اپنے خطوط میں "حبس دوام" بیوی کو "بیڑی" اور گھر کو "زندان" کہا ہے۔ اور ایک خط میں شادی کو "پھانسی کا پھندا" پکارا ہے۔ مگر یہ سب ظریفانہ اور تفریحی طرز بیان ہے کہ ان ذمہ داریوں کے لئے شاعری کی زبان میں یہی طرز ادا ہے۔ اور شرفاء کے یہاں ازدواجی تعلق کا احترام اور اسکی حُرمت ہمیشہ شرم و حیا سے وابستہ رہی۔ جہاں ایک جان دو قالب کی یگانگت کو بیگانگی کے پردے میں اخلاقاً رکھا جاتا تھا اور یہی ایمانی تقاضا بھی تھا۔ اس لئے خطوط میں غالب نے بیوی اور شادی کے متعلق جن الفاظ کا استعمال کیا ہے وہ درصل ان کی شوخی اور محض ظرافت کا نتیجہ ہے۔ ورنہ اپنی بیوی سے آپ کو بڑی محبت تھی۔ اگرچہ غالب رند تھے اور بیوی عابدہ صالحہ زاہدہ مگر غالب اپنی بیوی اور شادی سے ناراض نہ تھے اگرچہ ہر دو کے طبائع میں زمین آسمان کا بعد المشرقین تھا۔ اسی لئے حالی کے بیان کے مطابق "انھوں نے اپنے کھانے پینے کے برتن الگ کر رکھے تھے" (وہی شراب کی وجہ سے) غالب دیوانخانہ سے محل سرائے میں جب تک طاقت رہی کم سے کم دن بھر میں ایکبار جا آتے تھے۔ ایکبار کا کھانا دن میں بیوی کے ساتھ ضرور کھاتے تھے۔ پھر بھی آپ کے خطوط سے آپ کی گھریلو زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہو سکے ہیں شاید کیا بلکہ یقیناً اس زمانہ میں شرفاء اپنے خانگی حالات کو اسی طرح چھپایا کرتے تھے۔ برخلاف آجکے تمدن کے کہ وہ ہر ہر ممکن طریقے سے چھپلائے جاتے ہیں نہ کہ چھپائے جائیں۔

غالب کو اپنی بیوی اور گھر کی ساری ضرورتیں پوری کرنیکا عمر بھر پورا پورا خیال رہا۔

اولاد اور متعلقین غالب کے یہاں سات بیٹے اور کچھ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ جملہ تعداد لگ بھگ درجن بھر کے تھی مگر کوئی پندرہ مہینہ سے زیادہ زندہ نہ رہا، بہت رنجیدہ ہوئے اور آخر کار اپنی بیوی کے بھانجہ نواب زین العابدین خاں عارف کو بیٹا بنا لیا۔ غالب کو ان سے بڑی محبت تھی وہ بڑے خوش فکر شاعر بھی تھے۔ لیکن عین جوانی میں دو بچے چھوڑ داغ مفارقت دیگئے۔ غالب کو اسکا بڑا رنج رہا اور آپنے ان کی وفات پر جو درد بھرا مرثیہ بلکہ نوحہ لکھا ہے وہ آپ کی بہترین نظموں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے سوا آپنے اپنے فارسی کلام میں بھی عارف کی صلاحیتوں کی تعریف کی ہے۔

عارف کے انتقال کے بعد ان کے دو بیٹوں میں سے ایک کو غالب اپنے گھر لے آئے۔ عارف کی بیوی کا بھی انتقال ہو گیا تو دوسرے بیٹے کو بھی اپنے پاس رکھ لیا۔ ان دونوں سے آپ کو بڑی محبت تھی خود تکلیف اٹھاتے اور ان دونوں کی نازبرداریاں کرتے تھے۔ اکثر سفر میں ان کو ساتھ لے جاتے۔ اور ان میں سے ایک آپ کی زندگی ہی میں آلور میں ملازم ہو گئے اور وہیں انکی شادی بھی ہو گئی۔ یہ باقر علیخاں تھے اور یہ بھی اچھے شاعر تھے۔ دوسرے فرزند حسین علیخاں کی بھی رامپور میں ملازمت رہی۔ وہ بھی فارسی اور اردو دونوں میں شاعری کرتے تھے۔ غالب کو اپنے رشتہ داروں سے عمر بھر بڑی محبت رہی۔ خاصکر ان کا خیال آخری عمر میں بڑھتا ہی رہا۔

یوسف برادر یہ میرزا یوسف بیگ خاں، غالب کے چھوٹے بھائی تھے

غالب کو ان سے بیحد محبت تھی۔ غالب کے دِلّی آجانے کے بعد یہ بھی وہیں آگئے اور مستقل اقامت اختیار کرلی۔ یہ غالب سے دو برس چھوٹے تھے۔ تیس برس کی عمر میں دیوانگی کا حملہ ہوا، اور آخر دم تک اس سے نجات نہ ملی۔ وہ دِلّی میں غالب سے الگ ہی رہتے تھے۔ غدر کے زمانہ میں اُن کے بیوی بچے جے پور چلے گئے اور وہ اکیلے رہ گئے تو غالب نے ان کو اپنے پاس بلانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانے۔ اسی زمانہ میں یکایک چار پانچ روز بخار آیا اور انتقال کر گئے۔ شہر میں عجیب افراتفری پھیلی ہوئی تھی بڑی مشکل سے ان کی تدفین کا انتظام کیا۔ مرنے کے وقت انکی عمر ساٹھ برس کی تھی۔ غالب کو اپنے بھائی سے بے انتہا محبت تھی۔ انھوں نے ان کو اپنا یوسفِ ثانی کہا ہے۔ ایکبار وہ بیماری سے اٹھے تو کہا ؎

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

اُن کے بعد اُن کے بیوی بچوں کا بھی آپ کو بڑا فکر رہا۔ میرزا یوسف بیگ خاں کے نواسے ایک عرصہ تک حیدرآباد میں اڈیٹر جنرل رہے۔ ان کے داماد نے آخری عمر حیدرآباد میں بسر کی تھی۔

ملازم | اگرچہ بچپن کے سوا غالب کی عمر کا کوئی دور اطمینان اور مسرت کا نہیں گزرا پھر بھی انھوں نے ہر زمانہ میں اپنا امیرانہ ٹھاٹھ قائم رکھا اور اپنی روایتی وضعداری کی شان باقی رکھنے کی کوشش کی۔ گھر میں ہمیشہ تین چار ملازم رہتے تھے۔ ان کے نام خطوط میں آتے ہیں۔ مثلاً کلیان۔ ایاز۔ کلّو۔ وفادار جعفر بیگ، عنایت اللہ۔ نیاز علی وغیرہ۔ ان کے علاوہ اور بھی زنانہ حرم میں خادمائیں تھیں،

غدر میں سب آمدنیاں بند ہو چکی تھیں اور بڑی مفلسی کا عالم تھا اسکے باوجود غالب بیس آدمیوں کے کفیل تھے جن میں نوکر بھی تھے ۔ نوکروں سے بہت اچھا سلوک کرتے ۔ تنخواہیں برابر ادا کر دیتے اور اپنی غیر حاضری میں اسکا انتظام کر جاتے ۔

ج اخلاق و عادات

رِندی غالب کے خطوط سے یہ اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ انکی جوانی رنگا رنگ کی رنگینیوں سے مملو رہی ہے ۔ شراب نوشی کو تو سبھی جانتے ہیں لیکن بایں ہمہ صفائی معاملات آپ کا خاص ذاتی جوہر تھا جو زندگی بھر رہا ۔

مروّت ، ملنساری غالب دوستوں کے بڑے ہمدرد اور خادم تھے ۔ اسلئے حلقۂ احباب بیحد وسیع تر تھا ، اپنی آمدنی دوستوں پر خرچ کر دیتے اور مقروض رہتے تھے ۔ دور افتادہ دوستوں سے خط و کتابت کا باقاعدہ سلسلہ جاری تھا شاگردوں کے کلام پر اصلاح کیلئے تیار رہتے ، یہاں تک کہ مرنے کے ایک دن پہلے بھی ایک خط کا جواب لکھوایا ۔ مہمانوں کی بڑی خاطر تواضع کرتے ، اور بڑے ملنسار آدمی تھے ۔ زندہ دلی کا پتہ مکاتیب اور حالاتِ زندگی سے خوب لگایا جا سکتا ہے ، بے تعصب آدمی تھے ، شاگردوں اور دوستوں میں کتنے ہی ہندو تھے ۔

مطالعہ کا بڑا شوق تھا ۔ کتابیں خریدتے نہ تھے بلکہ کرایہ پر منگوا کر پڑھا کرتے تھے اور پھر وہ خزانہ خیال سے حافظہ میں لوحِ محفوظ کی طرح محفوظ رہتی تھیں مختلف علوم و فنون کے سوا ، ادب اور تصوف کی کتابوں کا کثرت سے مطالعہ کیا تھا ، فارسی شعراء کے کلام پر بڑا عبور حاصل تھا اسی لئے اپنی فارسی دانی کا بڑا دعویٰ ببانگِ دہل رہا ۔

یہی دعویٰ اُردو کے بارے میں بھی تھا، مُؤمن اور ذوق سے نوک جھونک تو ہوتی تھی لیکن ان کے اچھے اشعار کی بڑی قدر کرتے تھے۔ مؤمن کا یہ شعر سُنکر اس کے بدلے سارا دیوان دینے کو تیار ہو گئے تھے:- مؤمن

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اسی طرح ذوق کے اس شعر کو بہت پسند کرتے تھے:- ذوق

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

جس مشاعرے میں مؤمن ہوتے یہ نہ جاتے۔لیکن مؤمن کے مرنے پر بڑا حزن و ملال ظاہر کیا تھا۔

اسراف : بچپن ہی میں آپ لہو و لعب اور عیش و عشرت میں پڑ گئے تھے جس سے آپ کو اسراف اور فضول خرچی کی عادت پڑ گئی اور قرض کا عادی بنا دیا۔ یہ قرض کا سلسلہ گویا بچپن ہی سے شروع ہو گیا تھا جو اُس وقت امیرانہ ٹھاٹ کے لوازمات سے تھا لیکن آج تو وہی امیر و کبیر ہے اور وہی حسب نسب میں شریف ہے جس کے پاس چار پیسے ہوں چاہے ذات کا کچھ بھی ہو۔

غالبؔ کی مالی حالت

غالبؔ کے والد آگرہ میں خانہ داماد بن کر رہتے تھے والد اور چچا کی وفات کے بعد غالب اپنے نانا کے یہاں رہنے لگے تھے اور اسطرف سے بھی انھیں کافی جائداد ملی تھی۔ خود غالب کا خاندان اونچے درجہ کا تھا، پھر ننھیال بہت خوشحال

تھی، اسیرِ غالب کی شادی بھی اک مالدار شاہی گھرانے میں ہوئی تھی۔

غالب کی یتیمی کا ان کی شعروشاعری اور ادبی خدمات میں بہت حصہ ہے اگر وہ یتیم نہ ہوتے یا ان کے چچا دیر تک زندہ رہتے تو شاید غالب کی طبیعت شاعری کیطرف مائل نہ ہوتی اور بہت ممکن تھا کہ آپ بھی اپنے باپ دادا کی طرح سپاہی ہوتے اور اگر غالب ادیب و شاعر نہ ہوتے تو ان کے باپ دادا نانا اور سسرال والے بھی اتنے مشہور نہ ہوتے اور اتنی اہمیت کے مالک نہ سمجھے جاتے کہ اس زمانہ میں ایسے اور ان سے بڑے کافی بڑھ چڑھ کر بڑے ایسے کتنے امیر کبیر اور رئیس نہ تھے۔

غالب کو چچا کی جاگیر کے بدلے ۷۵۰/- روپیہ سالانہ پنشن ملتی تھی یعنی ۶۲ ½ روپیہ ماہانہ۔ انھوں نے اسے بہت کم سمجھا۔ اسے بڑھوانے کے لئے کلکتہ گئے۔ انگریز سرکار میں اپیل کی۔ انگریز بادشاہ اور انگریز حاکموں کی شان میں بڑے زوردار قصیدے کہے لیکن دو سال کلکتہ میں رہ کر ناکام واپس آئے۔ اس سفر میں لکھنؤ، بنارس کی بھی سیر کی۔ لکھنؤ میں نوابانِ اودھ کی شان میں قصیدے پیش کئے تو واجد علی شاہ نے پانسو روپئے سالانہ پنشن مقرر کردی۔ یہ پنشن ۱۸۵۶ء میں اودھ کے الحاق پر ختم ہوگئی۔

۱۸۴۲ء میں فارسی مدرسی کی خدمت قائم کی گئی تو مسٹر ٹامسن نے غالب کو چنا اور انٹرویو کیلئے بلایا۔ غالب پالکی میں گئے، منتظر رہے کہ رسم کے مطابق صاحب بہادر لینے کو استقبال کے لئے آئینگے۔ وہ غالب کو نوکر سمجھ کر نہ آیا، انھوں نے اپنی بےعزتی سمجھی اور واپس چلے آئے۔ پھر مولوی امام بخش صہبائی اس کام پر مامور ہوگئے۔ غالب بلاشک بڑے خوددار اور غیور تھے، پروفیسری کی پرواہ نہیں کی۔

لیکن ضرورت کے وقت آمدنی بڑھانے کے لئے عاجزانہ کوشش بھی کی یہاں تک کہ پینشن بڑھوانے کے لئے کلکتہ گئے قصیدے کہے انگریز افسروں کی شان میں، وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ پھر غدر کے بعد پوری پینشن ہی بند ہو گئی تو دوبارہ جاری کرانے کے لئے ملکہ وکٹوریہ، وائسرائے اور دوسرے تمام متعلقہ افسروں کی شان میں قصیدے لکھڈالے۔ ایسے ۲۵ قصیدے اور قطعے آپ کے فارسی کلام میں ملتے ہیں اک حد تک شرمندۂ تعبیر رہے اور ہمیشہ ہی رہتے اگر نواب رامپور کی مساعی جمیلہ مشکور نہ ہوں۔

دورِ مغلیہ میں غالب کا اعزاز انگریزوں کے یہاں اک وقتی ڈپلومیسی پر تھا۔ اب جبکہ فرنگی پورے اقتدار اور مکمل تسلّط کے ساتھ ہند پر جابر قابض اور متصرف تھا، شہنشاہ سراج الدین ظفر کی محصور حکومت صرف قلعۂ معلّےٰ میں تھی تو بیچارے اس ادیب و شاعر کو بلا کسی خاص ضرورت اور مصلحت کے انگریز کیوں چارہ ڈالتا۔ جبکہ اور سینکڑوں خوشامدی موجود ہوں۔

غالب کی شوخی اور ظرافت ادب میں ایک خاص مقام رکھتی ہے انکی زندگی میں اور ان کے ادب میں اسکی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ آج انکی ادبی حیات کے مطالعہ میں سب سے زیادہ ہمیں اسی ظرافت سے لطف حاصل ہوتا ہے۔ آپکی ظرافت فطری اور غیر مصنوعی تھی اور آج جو ظرافت کو ایک خاص فن کی صورت دیدی گئی ہے یہ سب بناوٹ اور تصنع ہے۔ آپکی ظرافت آپ کی زندہ دلی پر حاکم ہے آپنے مصیبت کو مصیبت نہ سمجھا، ظرافت سے اپنے کام نکال لیتے۔ مثلاً غدر کے بعد کسی سلسلے میں کسی انگریز افسر نے پوچھا، ویل! تم مسلمان ہو؟" حضور آدھا" اس نے پوچھا کیا مطلب؟ آپنے جواب دیا" شراب پیتا ہوں، سؤر نہیں کھاتا۔"

آپکی شراب نوشی مشہور ہے لیکن کبھی آپنے اسے عیب سمجھ کر چھپایا نہیں اور اُسے گناہ ہی سمجھا۔

آم کھانے کا بھی شوق آپ کا بہت مشہور ہے۔ تذکروں میں جسکے تفصیلی واقعات ہیں۔

دادا کی وفات کے بعد غالب کے باپ عبداللہ بیگ خاں اور چچا نصراللہ بیگ خاں دونوں سپاہی رہے۔ دونوں کی وفات غالب کی کمسنی میں ہو گئی۔ باپ کی موت کے بعد غالب کے چچا، غالب اور ان کے بھائی بہن کے کفیل رہے انکو انگریزی فوج میں رسالداری کا منصب اور جاگیر ملی۔ لارڈ لیک نے دس ہزار روپے سالانہ کی جاگیر پسماندگان کیلئے مقرر کرادی لیکن ایجنٹ نواب احمد بخش خاں نے فقط تین ہزار روپیہ سالانہ دئے اسمیں سے ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ غالب کو ملتے رہے۔

آپ کو چوسر کھیلنے کا شوق تھا اور ہمیشہ تفریحاً کچھ بازی بدکر کھیلا کرتے تھے کہ ہار جیت میں کچھ لطف و سوز رہے۔ کوتوال شہر کو آپ سے کچھ عناد تھا ۱۸۴۷ء میں جوئے کے الزام میں چھ ماہ کی سزا کرادی لیکن تین ہی ماہ میں رہا کر دئے گئے اگرچہ اس قید میں آپ سے باعزت سلوک کیا جاتا تھا مگر غالب کے دل پر اسکا بہت بڑا اثر تھا گو لوگوں میں آپ کی وقعت وہی رہی۔

واضح رہے کہ غالب کی اسیری کا واقعہ تو مسلّم ہے وہ اگر جوئے کے الزام میں ہے کوتوال کے عناد میں ہی سہی تو یہ نرا غلط ہے بلکہ مغالطہ ہے اور سوانح نگاروں کی مسامحت ہی یا پھر بجز سہل انگاری اور کچھ نہیں چنانچہ یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

قرض کی پیتے تھے مے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہاں　　رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

کہ بنیئے کے مہاجنی قرضے سود در سود کی عدم ادائیگی پر حاسدوں کے اغواء سے
غالب نے اپنے برادر یوسف کی محبت میں یہ سنتِ یوسفی پوری کی اور اس قید سے
رہائی تین ماہ بعد یا چھ دن بعد ہوئی۔ بہر حال جوئے کے الزام میں قید کی روایت
قابل تامل ہے۔ یا یہ غلط در غلط یادہ غلط، مگر میرے خیال میں بنظر نقد و تبصرہ
دیکھا جائے تو وہی غلط معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ جوا ایک اخلاقی جرم ہے پھر
قید میں ایک اخلاقی مجرم کی عزت کیسے، دوسرے چھ ماہ کی قید اور تین مہینوں کے
بعد یہ رہائی بلا وجہ چہ معنی، کونسی تاجپوشی کی خوشی میں قیدی چھوٹ رہے تھے۔
الغرض صورت حال درحقیقت یہ ہے کہ قرضہ کی عدم ادائیگی پر یہ قید اک نظر بندی
ہوتی ہے جس میں قیدیوں جیسی محنت کرنی پڑتی ہے اور نہ قیدیوں کے کپڑے پہننا
پڑتا ہے اور نہ ہی قیدیوں کا کھانا پڑتا ہے بلکہ قرضخواہ کو مہینہ بھر کے راشن
کی رقم جیلر کے پاس پہلی سے پہلے جمع کرا دینا پڑتا ہے ورنہ مہینہ کی آخری شام کو
یہ قیدی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پھر دوبارہ از سر نو مقدمہ کی ڈگری پر اس نظر بندی
کا دوبارہ امکان ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ کوتوال کی سازش میں دوسرے
حاسد بھی شریک تھے، بنیئے کو بہکا کر ایسا کرا دیا گیا کہ دعویٰ پھر ڈگری اور عدم ادائیگی
پر وہی خصوصی قید نما نظر بندی۔ بعد کو خود منصف حاکم کو اور دوسرے احباب کو
افسوس ہوا، اور قرضے کی ادائیگی پر بنیئے سے لا دعویٰ لیکر غالب کو چھڑا لیا گیا۔
اس ہماری توجیہ کی یہ کلام بھی حمایت کرتا ہے ؎ حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جسکی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا اور ؎ ہم غمزدہ جس دن سے گرفتار بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں — قید سے رہا ہو کر یہ کپڑے وہیں پھاڑ کر
پھینک آئے تھے کہ اپنا ذاتی تھا سرکاری قیدیوں کا نہ تھا۔ غرضکہ

اس سودی قرضہ کی قید تھا جس میں غالب کے کپڑوں میں جوئیں پڑ گئی تھیں کہ کپڑے اپنے ذاتی گھریلو تھے جیل کے نہ تھے کہ آپ قیدی نہ تھے۔ بخیہ گری قیدی کے کپڑوں میں نہیں ہوتی وہ تو موٹے ڈھاٹے کھدّر کے ہوتے ہیں اور دھلتے رہتے ہیں قیدی ہی دھوتے ہیں انھیں سے دھلائے جاتے ہیں۔ سوانح نگاروں کا یہ مغالطہ ہے یا سہل انگاری کہ کوتوال کے عناد پر اس کی کوتوالی کو ہی غالب کا قید خانہ سمجھ لیا گیا ہے، یہ عدم ادائے قرض کی قید ڈگری پر آج بھی ہے جو اک طرح کی نظر بندی کہلاتی ہے اور اکثر کا مقصد محض ذلیل کرنا ہوتا ہے نہ کہ قرض کی بازیابی اور ضمناً یہ بھی رہتا ہے کہ اس دباؤ میں قرضہ بھی وصول ہو جائیگا، یہ قید و بند جرائم پیشہ کی قید نہیں کہلاتی۔

غالبؔ کا قلعۂ معلّٰی سے تعلق

۱۸۵۰ء میں آخری مغلیہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے آپکو شاہی تاریخ لکھنے پر مقرر کیا یعنی تاریخی مواد کو اپنی فارسی میں ڈھالیں۔ نجم الدولہ دبیر الملک، نظام جنگ کا خطاب دیا، خلعت دی اور پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی۔ ۱۸۵۴ء میں ذوق کا انتقال ہوا تو غالب استاد شاہ بھی بن گئے۔

رامپور کے شہزادے نے دلّی میں غالب سے فارسی پڑھی تھی وہ تخت نشین ہوئے تو آپ کو شاعری میں اپنا استاد بنا لیا۔ شاہ دلّی سے آپکے تعلقات تھے اسلئے غدر میں آپ کی پنشن بند کر دی گئی۔ تین سال بعد نواب رامپور کی کوشش سے بحالی ہوئی۔ کلب علیخاں والیٔ رامپور بنے تو انھوں نے بھی غالب کے

روپیہ ماہوار جاری رکھے۔ ان دونوں درباروں سے تنخواہ کے علاوہ صدہا روپے ملتے تھے۔

غالبؔ کے مربیؔ

غالب کے دوستوں اور شاگردوں میں کچھ نواب، رئیس اور جاگیردار تھے۔ ان سے غالب کو ہمیشہ مدد ملتی رہی۔ ان سے امداد حاصل کرنے کے لئے غالب نے حد سے زیادہ عاجزی اور زاری بھی کی ہے جس کا پتہ "مکاتیب غالب" کے خطوط سے چلتا ہے۔ یہ کتاب شائع ہو چکی ہے اور اس میں وہ خطوط بھی جمع کئے گئے ہیں جو رامپور کے رئیسوں کے نام آپ نے لکھے تھے۔ لیکن رامپور کے ان محسنوں کی شان میں کیا آپ نے صرف پانچ قصیدے کہے، صرف خطوط میں تعریف اور عاجزی کا اظہار کیا ہے بعض احسانات کا ذکر ہی نہیں۔ مثلاً رامپور رئیس نواب کلب علی خاں نے سات ہزار روپئے عطا کئے۔ غالب نے رامپور کے قیام کے ذکر میں اس معقول رقم کو قصداً نظر انداز کر دیا ہے تاکہ دوسرے مائل بکرم رہیں۔ نیز میرے خیال میں ایسا آتا ہے کہ نواب کلب علیخاں کی مشہور شخصیت علم پرور رہی ہے اور غالب کو اپنے سو روپئے ماہوار وظیفہ سے بھی زیادہ ابھی ان سے مزید استحقاق کی حقداری کی توقع تھی۔ یہ رقم سات ہزار کی بھی اگرچہ علاوہ ماہانہ وظیفہ کے بہت کچھ وزن رکھتی ہے پھر بھی غالب کی شکم پری کے باوجود غالب کی چشم سیری کیلئے ناکافی تھی۔ کچھ بھی ہو، استحقاقاً ہی سہی ذکر احسان ضروری تھا۔ یہ بخلِ کلام اپنے اک مربی اور محسن کے حق میں مناسب نہ تھا۔ باقی اللہ بہتر جانے۔

(د)

متفرقات

غالبؔ کی انفرادیت

جسم ہے اک قوم اور شاعر ہے آنکھ   درد ہوتا ہے کہیں روتی ہے آنکھ

شاعر قوم کی اُس ذی حس ہستی کا نام ہے جو قوم کے عروج و زوال میں سب سے پہلے قوم کی زبان سے بولتا ہے اور قوم جو کچھ کہنا چاہتی ہے قوم کے پاس زبان بیانِ مطلب کے لئے یہی شاعر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شعرا اپنی قوم اور اپنے وقت کے ہم آہنگ نہیں ہوتے وہ پوجے جاتے ہیں نہ پوچھے جاتے ہیں۔ قوم انھیں کو سروں پر بٹھاتی ہے جو ہم آہنگ ہوں۔ یہ شعری اعزاز "سونے پر سہاگہ" جب ہوتا ہے کہ شاعر میں خود اس کا کردار اس کا ہم نوا ہو۔ یہ حقیقت گفتار و کردار کے امتزاج کی جس قدر جس شاعر میں ہوگی اسی قدر اس کی قدر و منزلت ہوگی۔ یہ بات متشاعر میں نہیں ہوتی وہ نرا قوال بھاٹ ہوتا ہے بلکہ بھانڈ ہوتا ہے۔ قافیہ پیمائی پر اپنی لفاظی سے قوم کو مسحور کرنا چاہتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ع "ایں خیال است و محال است و جنوں" یہ نہیں ہو پاتا۔

جب اقوامِ عالم میں شاعری زندہ تھی تو قوموں کے عروج میں شاعر کو بڑا دخل تھا۔ حکومتیں شاعر کو انقلابی سمجھکر شاعر کی نازبرداریاں کرتی تھیں اب دورِ متشاعری ہے اسلئے ع پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ کا زمانہ ہے تاہم اس نقل اور اس مجاز میں بھی اگر کچھ جھلکیاں اصل اور حقیقت کی ہوں تو یہ پرچھائیاں بھی اپنی آؤ بھگت بہت کچھ کرا لیتی ہیں۔ چنانچہ آج بھی نثری تحریر و تقریر میں لاکھ صلواتیں کسی کو سنادیں وہ اثر انگیزی نہیں ہوتی جو شعری صورت میں ہوتی ہے۔

جوشؔ جیسے رند مشرب کو بھی انگریزوں نے اس کی انقلابی نظم حریت پر حراست میں لے لیا تھا کردار کے فقدان کے سبب معافی پر چھوڑ دیا، اور نہ چھوڑا تو حسرتؔ موہانی اور ظفر علی خاں کو جنھیں جیل، جرمانے بھگتنے پڑے اور حسرت موہانی کی تو عمر کا تو بیشتر حصہ ہی قید افرنگی میں گزرا۔

اظہارِ واقعیت

ع چمن میں تلخ نوائی مری گوارہ کر۔ اک وہ زمانہ تھا کہ کسی امیر نے عرب شاعر سے کہا "اِمدَح" میری تعریف کر۔ اس نے کہا "اِفعَل" "اَمدَح" کچھ کر کے ہی کچھ کہوں۔ آج کے قصیدے اصلیت نہ ہونے پر حقیقت میں مرثیے ہیں مگر جب قوم کا مزاج ہی بدل جائے کہ برسی کو سالگرہ کہے اور خوشیاں منائے کہ خیر سے ایک سال عمر سے کم ہوا۔ "خس کم جہاں پاک" دریا برد ہوا۔ کچھ بھی ہو نظامِ قدرت میں فتور نہیں آتا، بے عمل قوم کو عالم، شاعر اور حاکم بھی بے عمل دیا جاتا ہے جیسا کہ دیا گیا، دیا جا رہا ہے اور دیا جاتا رہے گا۔

قوم کی عقیدت کا معاملہ جب اسی غیر فطری رجحان پر ہو تو آپ بھی اپنی بے عملی کی اس غیر طبعی، پسند طبع پر اقبالؔ کو لاکھ دیوتا سمجھ لیں مگر وہ خود کہتا ہے کہ "میں اک قوال ہوں میرا کام ہنسانا اور رلانا ہے نہ کہ ہنسنا اور رونا" اور کہتا ہے ع "گفتار کا غازی بن تو گیا، کردار کا غازی بن نہ سکا" یہ حقائق ہیں جو بدلتے نہیں ہیں، اقبالؔ کو خود تم نے جنم دیا جیسا کہ اکبرؔ، حالیؔ کو۔ یہ ہمارے ہی اک ذی حس عنصر تھے جنھوں نے اپنے ماحول میں ہماری بے بسی

کو ہماری بے عملی کو اپنی زبان اور اپنے قلم سے ظاہر کیا ہے، ہم خود بے عمل تھے قدرت سے ہمیں ہر چیز بے عمل ملی۔ ہم باتوں سے خوش اور رنجیدہ ہونے والے ہمیں عمل سے کیا سروکار۔ چنانچہ جو پیغامِ حیات سرفروشی کا اقبال نے دیا عملاً خود اس نے اور ہم نے کتنے میدان جہاد و اجتہاد سر کئے جو قوم عمل سے کوری ہو، کلام الٰہی کی اس کے پاس محض یہ عظمت ہو۔ ع

تعویذ بنایا جاتا ہوں سینوں سے لگایا جاتا ہوں" وغیرہ وغیرہ۔ تو بیچارے کلامِ اقبال نے محفلِ وعظ کو تو کم از کم گرما ہی دیا۔ عمل کیلئے نہ قوم تیار تھی نہ اقبال کو کردار کی عملی صورت بنکر پیش آئی۔ چنانچہ ہر دور میں تاریخ جو ایک نثری شاعری ہے اور قصیدہ جو نظمی شعرستان ہے تمدن اور ماحول کا اثر ان پر لازمی رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اقتدار میں اور تسلط کے دور میں غلط تاریخیں لکھائی جاتی رہی ہیں، اور غیر معقول اصلیت سے خارج وہ غلط قصیدے لکھے گئے ہیں کہ موصوف ممدوح میں ان اوصاف کا واہمہ خیال بھی نہ ہو۔ انھیں شعراء کے سامنے چارہ ڈالا جاتا ہے جو بھانڈ ہوں مگر ہسٹری آف سولیزیشن آجتک نہ غلط لکھائی جا سکی۔ اس پس منظر پر غالب کے زمانہ کا جائزہ لیجئے۔

مرحوم عالمگیر کے بعد سے فرنگی رخنہ اندازیوں کا زور بڑھتا رہا بالآخر شاہ ظفر کے دور خلافت میں انگریزوں کا تسلط پورے براعظم ہند پر تھا، سلطان ٹیپو کی شہادت سے فرنگیوں کے حوصلے بلند ہو کر ان کے بنگلوں میں خونِ حریت سے چراغ روشن ہو چکے تھے اور یہ انند تھے۔ مغل شہنشاہ محض کٹھ پتلی قلعۂ معلّٰی کی محدود چار دیواری میں محصور اپنے اوراد و مشاغل میں مصروف۔ اپنا غم غلط۔

ع ۔ دِلّی ظفرؔ کے ہاتھ سے پل میں نکل گئی ۔ شعر و سخن سے کر لیتا تھا۔ قوم دو حصّوں میں بٹی ہوئی تھی، خود ہمارے اسلاف کچھ شاہ کی حمایت میں تھے جن کی جائدادیں ضبط ہوئیں۔ ہمارا بھی ایک گاؤں پھاڑا نامی ضبط ہوا، اور کچھ انگریزوں کے یہاں فوجی اقتدار پر تھے۔ نواب میرٹھ کا مقابلہ اس غدر کا آخری مورچہ تھا۔ قضائے مبرم کہ سوئے اتفاق سے غالب کی بھی کچھ ایسی ہی پوزیشن دو رُخی سی تھی کہ جملہ اسلاف اور متعلقین انگریزوں کے حلیف نمک خوار تھے اور ع لے روشنی طبع تو بر من بلا شدی۔ خود غالب اپنی فنکاری سے استادِ شہ کی نسبت پر انگریزوں کے حریفوں میں خوامخواہ گنے جا رہے تھے حالانکہ قلعہ کا داخلہ خود حکیم احسن اللہ خاں کی بدولت جو معتمد خاص انگلش تھا عمل میں آیا تھا کہ افرنگی سیاست کے دو چار مہرے قلعہ میں ضرور رہیں مگر غدر میں غالب بھی شاہ کے بہی خواہ مورد عتاب تھے۔ الغرض اس مخلوط اثر کے لازمی نتیجہ پر غالب کی عمر کا بہترین حصہ پارس پتروہی میں گذر گیا اور غالب جیسے آزاد منش مرد حر کو بھی کفر گڈھ کے در پر انگریزوں کی خوشامد میں گھٹنے ٹیک دینے پڑے اور وہ ناک رگڑنی پڑی کہ "العیاذ باللہ" اس پر بھی یہ جبیں سائی انگریز دربار میں کسی درجہ مقبول و مسموع نہ ہوئی اور غالب اُدھر میں رہے۔ ع

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم، نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے ۔

الحاصل!

آنکہ شیراں را کند روباہ مزاج   احتیاج است احتیاج است احتیاج

ایسے دور کے شاعر خود متضاد طبع ہوتے ہیں کل جن کی مدحت میں زمین آسمان کے قلابے ملائے تھے آج انھیں کی کھال اُدھیڑنے میں سودائے وقت بلکہ اور

چار قدم آگے نظر آتے ہیں۔ مگر یہ جذبہ انگریزوں سے بغاوت کا غالب کے یہاں نہیں ملتا۔ اگرچہ انگریزوں نے قلعۂ معلےٰ کے تعلق سے بدگمانی پر سکّوں کی سازش کے سلسلے میں غالب کو بھی مطعون سمجھ کر اس کی بھی پینشن بند کر دی، مگر غالب ہیں کہ جنگی شان میں در جنوں قصیدے کہے ہیں اب اسی قلم اور اسی زبان سے ہجو افرنگ کیسے سرزد ہو۔ ان کی اسی استقامت کے سامنے کفرِ افرنگی نے مات کھائی اور غالب بیگناہ بخشے گئے۔ یہ تو تصویر کا ایک رُخ ہے مگر ادب ذہنی طور پر اس سے متاثر ہوئے بغیر کب رہتا، چنانچہ تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ ہو کہ اس ضمنی تضاد کے حامل غالب کے وہ اشعار لاشعوری پر ہی سہی ضرور ہیں جو اس طبعی تضاد کو بتا رہے ہیں مثلاً یہ ملاحظہ ہو ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں تھے کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اور پھر یہ بھی دیکھئے ؎

ہم پکاریں اور کھُلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھُلا

پھر یہ بھی ملاحظہ ہو ؎

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دُعا
وہ دن گئے جو کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

یہ ہجو ملیح قسم کا شعر ہے جہاں "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" ہے وہیں اعتراف گناہ بھی قیامت ہے احساسِ گناہ کی حقیقت اک پُر لطافت ندامت اور شرمساری کی حد تک دقیع اور پسندیدہ ہے۔ غالب نے اپنی فطری آزادی کو بچانے کی اس نوکری اور غلامی میں کھُلے اعتراف کے پردے میں پیش کرکے معقول حد تک کوشش کی ہے اور کہیں ندامت کے لباس میں پیش کی ہے جہاں بجز اس کے کوئی چارۂ کار نہ تھا ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یہ بقول اقبال وہی ہے

ولیکن بندگی استغفراللہ   یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

کا ملحدانہ جذبۂ انانیت ہے۔ ہم غالب کی آبرو بچانے کے لئے کہدیا کرتے ہیں کہ نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا اے خدا ہوتا غالب کا افسوس ہونے پر اسلئے ہے کہ خدا تو بہرحال تھا اور رہے اور رہے گا ہم نہ ہوتے تو خدا ہی میں تو ہمارا وجود مگن ہوتا وہ اس ہماری پیدائی سے ہزار درجہ برتر تھا۔

غرضکہ ہمیں اسوقت کچھ ادبی پہلو سے حقائق کی نشاندہی منظور ہے کہ سیاست سے وقتی ادب بھی متاثر ہوتا ہے جو قوم کو مخالف، موافق گروہ میں تقسیم کر دیتا ہے خود غالب جیسے مرد حُر کبھی دانستہ کہ نادانستہ ملاحظہ پر تقلید والوں کی حمایت میں پیش پیش نظر آتے ہیں، جہاں سید احمد شہیدؒ محدث اسمٰعیل شہیدؒ جیسے مجاہدان ملت خود کو سیاسی تقلید سے بیزارگی پر مذہبی تقلید سے بھی خود کو آزاد بتائیں وہاں ان مجاہدوں کے حریف والے گروہ میں غالب اپنی توانائی صرف کر رہے ہیں کہ انگریز آقا خوش رہے۔

دہلی غدر میں جہاں اچھے اچھوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور پاؤں سر پر رکھ کر بھاگ اٹھے غالب ہیں کہ وہیں ڈٹے رہے اگرچہ مسیح الملک اول حکیم محمود خاں کے ایماء پر پٹیالے کے راجہ کی طرف سے ایک دستہ غالب کے گھر پر حفاظت کے لئے رہتا تھا مگر غالب اپنی استقامت طبع پر قطب ازجانی جنبد

رہے انگریزوں کے خود ساختہ سایۂ پناہ میں دِلّی ہی میں رہے اور غدر کے سات سال بعد اک خط میں کسی صاحب کو لکھتے ہیں "اب مسلمانوں کو گھر کرایہ پر ملنے لگے ہیں۔" یعنی اب آجاؤ۔ معلوم ہوا کہ افرنگی سیاست نے صرف مسلمانوں پر ہی دِلّی کی اِدھر زمین تنگ کر رکھی تھی کہ گھر تک نہ دئے جاتے اور اُدھر خونی دروازہ پر سات سال مسلم علماء صلحاء کو چُن چُن کر پھانسی دینے کا سلسلہ اک تاریخی ریکارڈ ہے مسلم عناد کی حد ہے کہ ان مظلوموں کو کرایہ پر گھر تک اس مدت میں نہ دیا گیا۔ اسی کا نام مسٹری آف سویلزیشن ہے کہ غالب کے اس غیر ارادی جملے نے یہ عقدہ کشائی کی اور ادب بھی اس کے فیض سے مستور الحال نہ رہا۔ بہر حال غالب ہی کی یہ واحد شخصیت ہے کہ جو اِدھر مجاہدِ ملت مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی صدر الدین آزردہ سے ہم صحبت ہیں وہیں سر سید جیسے قائد سے ہم آہنگ ہے جو فرنگی اقتدار کے حامی اور بہی خواہ تھے اسیر طرفہ تماشا اپنے مقام اور اپنی ادبیت کو بچائے ہوئے "ہر کسے را بہر کارے ساختند" نظام قدرت میں غالب کی شخصیت نے وہ اہم رول ادا کیا ہے جس کے لئے پوری قوم اور ہمارا ادب غالب کا ممنونِ احسان ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ فن تنقید کے امام اور بابائے نقد و تبصرہ سر سید ہیں یہ محض خوش فہمی ہے۔ اس فن کی داغ بیل غالب نے ڈالی جب آپ نے اپنے ہمعصروں کو اپنی ادبی چشمکوں سے وہ تگنی کا ناچ نچایا وہ وہ اعتراض کئے کہ اُٹھائے نہ اٹھے۔ اس فن تنقید کی تخم ریزی کا جب شجر بار آور ہوا تو اسکے پھل سبھوں نے کھائے۔ سر سید کچھ پیش پیش رہے اس لئے فن نقد و تبصرہ میں تنقیدی مقام اولیت کا صرف غالب کو میسّر ہے۔ اس کا سہرا غالب ہی کے سر ہے۔ سبھی اس منفرد شخصیت کے

مقلد ہیں ۔ نیز اگر غالب کی اُردو خطوط نویسی اُردو ادب پر اثر انداز نہ ہوتی تو آج ہم اسی فسانۂ عجائب کے عجائب گھر میں یا کسی چڑیا گھر میں "مرغِ زریں" بنے ہوئے نظر آتے ۔ اگرچہ اس طرز کے موجد بھی غالب اور خاتم بھی غالب کہ غالب کی کوئی بھی بجا تقلید نہ کر سکا مگر اس عکاسی میں اتنا فائدہ تو سبھوں کو ہوا کہ سہل اُردو لکھنا آگیا اور مبتذل تشبیہات سے اُردو شاعری پاک ہوگئی ۔ باقی تفصیلات آئندہ غالب کی ادبی حیات، ادبی خدمات، اور اہم معلومات میں میں ملاحظہ ہوں ۔

غالبؔ کی ادبی چشمک

غالب کسی ہندوستانی کی فارسی دانی کے قائل نہیں تھے ۔ خاصکر اپنے زمانہ کے اور قریب کے شاعروں اور مصنفوں کو بالکل ہیچ سمجھتے تھے ۔ ہندو فارسی دانوں سے تو گویا آپ کو ازلی دشمنی تھی ۔

غیاث اللغات کے مصنف ملا غیاث الدین اور برہان قاطع کے مصنف سراج الدین علی خاں آرزو ۔ فرہنگ جہانگیری کے مصنف شیخ رشید، اور ٹیک چند بہار ان سب کو آپ نالائق سمجھتے تھے ۔ ان کا کہنا تھا کہ کسی ہندوستانی کو فارسی میں مستند نہیں سمجھا جا سکتا ۔ پورے ہند میں ڈیڑھ نفر کی فارسی دانی کے قائل تھے ایک میر خسرو اور آدھے فیضی ۔ مولوی الٰہی بخش صہبائی آپ کے ہمعصر دوست اور فارسی کے پروفیسر تھے ۔ ان کو سارا زمانہ فارسی میں مانتا تھا لیکن غالب کے پاس کوئی وقعت نہ تھی ۔ لکھتے ہیں کہ "وہ شخص کتنا نالائق ہوگا جو صہبائی کی شاگردی

پر ناز کرتا ہو۔ یہ تب کہا جب برہان قاطع کی غلطیاں ثابت کرنے کو غالب نے قاطع برہان لکھی کسی شخص نے اسکے جواب میں ساطع برہان شائع کی جو صہبائی کا شاگرد تھا۔

الحاصل! ہماری یہی تحقیق ہے اور بعد کو اہل زبان محققین نے بھی اسکو تسلیم کیا ہے کہ غالب کے اعتراضات بعد کی تحقیق سے بالکل درست ثابت ہوئے اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ غالب کی شخصیت سے ادبی دنیا اسکے مرنے کے پچاس برس بعد آگاہ ہوئی اور آج اس کی قدر و منزلت کا اس کو صحیح مقام ملا ہے جو ہندیوں کی مُردہ پرستی پر مزید استشہاد ہے۔

غالبؔ کا مذہب

غالبؔ کے مذہب کے بارے میں بڑی لے دے رہی ہے بعض کہتے ہیں کہ آپ شیعہ تھے کوئی کہتا ہے کہ آپ تفضیلی تھے جیسے میر عثمان علی خاں نظامِ دکن۔ کوئی آپکو شیعیت کی طرف فقط مائل بتاتا ہے اور کوئی بیدین، ملحد اور لا مذہب کہتا ہے اور بعض لوگ آپ کو صوفی بھی مانتے ہیں۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خود غالب سے متضاد عقائد ظاہر ہوئے ہیں۔ کہیں خود کو خود صوفی کہا ہے۔ کہیں حضرت علیؓ کی تعریف کرتے ہیں کہیں باقی تین خلیفوں سے تبرائی بیزارگی اور ہلکے الفاظ بلکہ ناروا انکی شان میں ظاہر کرتے ہیں۔ اور کبھی مذہب کے بنیادی عقائد سے اختلاف ظاہر کرتے ہیں اسکا سبب یہ ہے کہ آپ بڑے ظریف بڑے شوخ اور کچھ شریر قسم کے تھے مگر فسادی نہ تھے اور اس کے ساتھ ہی کریلا نیم چڑھا شاعر اور شرابی بھی تھے۔ غالب کے باپ دادا سب سُنّی تھے۔ انکی بیوی سُنّن تھی، ان کی سسرال والے سُنّی تھے اور سب کے سب چشتی طریقے میں مرید بھی تھے۔

غالب نے بھی ایک جگہ خود کو "چشتی نظامی" بتایا ہے۔ انھوں نے بارہا صوفی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اسکے معنی صوفی طریقت کے نہیں کہ میں بھی کوئی صاحب نسبت صوفی، غوث قطب ابدال صاحب کشف و کرامات ہوں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اک رند قلندر صاف طینت ہوں۔ چنانچہ کہتے ہیں ع آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل۔ اور واقعی غالب ایسے ہی تھے۔

غالبؔ کا تصوّف

غالب نے تصوف کا گہرا مطالعہ کیا تھا ان کے اردو اور فارسی کلام میں تصوف کے مسائل بکثرت ہیں لیکن صاف ظاہر ہے کہ آپ کا صوفیانہ کلام محض شاعری ہے۔ دل کا ترجمانِ حقیقت نہیں ہے۔ کلام کی زبان فقط صوفیانہ ہے۔ شاعر کا دل صوفی نہیں ہے یہ دماغ کی حد تک صوفی ہیں۔ ان کے کلام کا میر درد کے کلام سے موازنہ کیجئے تو یہ فرق واضح ہو جائے گا۔ درد کا کلام بھی پُر درد صوفیانہ ہے اور دل بھی صوفی ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ غالب کی ساری عمر بلا امتیاز رنگ و ملت خدمت خلق میں گزری جسے سعدیؒ تصوف کی جان بتاتے ہیں ؎

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجّادہ و دلق نیست

بہر حال اور بہر طور البتہ آپ شیعیت کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ضرور تھے۔ آزاد اور حالی دونوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ الحاصل! غالب اک اچھے خاصے رند مشرب آدمی تھے۔ رندی کے ساتھ خاص جذب و انجذاب کا شغف تھا۔ اور خدا کی بنائی ہوئی صورت تھے۔

اہلیہؒ کا انتقال

امراؤ بیگم غالب کے سال بھر بعد دنیا سے اُٹھ گئیں۔ خاص اس روز جس دن غالب کی برسی کی فاتحہ کی تیاری کرا رہی تھیں اچانک انتقال کر گئیں۔ انکی بیوگی کا زمانہ بڑی مصیبت اور عسرت میں کٹا۔ غالب کی خاندانی پینشن بھی ان کو نہ ملی۔ انھوں نے غالب کا قرضہ چکانے کی جو آٹھ سو روپیہ تھا بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکیں بڑی مشکلوں سے آخر کار نواب ضیاء الدین احمد خاں نے قرضخواہوں سے کچھ معاف کرایا اور باقی اپنے پاس سے دیا۔

نوٹ:۔ یہ اہلیہ کا انتقال تاریخی پہلو سے غالب کے بعد لایا جاتا ہے مگر ہم نے اس مضمون کو سانحۂ ارتحال غالب پر ختم کرنا چاہا اسلئے یہ جزوی تقدیم نظر انداز کی جائے۔

غالبؒ کا ارتحال

اس مردِ حُر کا سفر آخرت تہتر برس کی عمر میں ہوا کہ اسلام کے تہتر فرقوں کی وحدت کا طالب غالب تھا۔ یہ سانحہ بتاریخ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ کا ہے مادہ تاریخ "آہ غالب بمرد" ہے خود غالب نے اپنی تاریخ وفات "غالب بمرد" کبھی پہلے مقرر کی تھی جب کسی نے ان کا مصرعہ اس طرح غلط پڑھا ع کیستم من کہ تا ابد بزیم۔ بولے لاحول ولا قوت، یہ میرا مصرعہ نہیں ہے یہ فارسی لالہ قتیل کی ہوگی۔ میرا قطعہ یہ ہے

کیستم من کہ تا ابد باشم	چوں نظیری نماند و طالب مُرد
در بگوید در کدامیں سال	مردِ غالب! بگو کہ غالب مُرد

یہ مادۂ تاریخ ازروئے نجوم نہیں بلکہ ازروئے کشف ہے۔ اگرچہ مشیتِ ایزدی میں یہی تھا کہ آٹھ برس بعد انتقال ہو۔ یہ کمی آہ اور ب سے پوری ہو گئی۔ میرے خیال میں غالب نے اپنے بچپنے کے آٹھ سال محسوب نہ کئے ہونگے کہ وہ بہرحال اطمینان کے تھے باقی "الدنیا سجن للمومنین" ایمانداروں کے لئے یہ دنیا قیدخانہ ہے سو اس قید کے ایام وہی ہیں جو "غالب مرد" سے آشکارا ہیں۔

الغرض الحاصل! ع ہم کیا رہیں گے جب نہ رسولِ خدا رہے۔
غالب بھی علیٰ کل غالب آخرالامر، کل نفس ذائقۃ الموت، دنیا سے رخصت ہوئے۔ اور اپنے سسرالی خاندان کے قبرستان میں سلطان جی عرف نظام الدین اولیاء میں مدفون ہوئے جہاں کچھ سال پیشتر سہراب مودی نے اک عالیشان چاندنی بنوادی تھی۔ اور کلام غالب کی شہرت خواص سے گزر کر عوام تک فلم غالب کی بدولت پہنچ چکی تھی اور آج وہ سونے پر سہاگہ مزید آراستگی کی خواہاں ہے۔ اللہم زد فزد۔ اور واقعی غالب بقول غالب ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ مرحوم و مغفور ایسے ہی تھے۔

معلومات عامہ ــــــ مختصر سوانح حیات

ختم ہوئے

۲- ادبی حیات

غالب کا علمی ماحول[1]

یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ غالب کی تعلیم محض رسمی تھی اور غالب نے اپنی خداداد ذہانت سے اس میں یہ وہبیت کی شان پیدا کرلی تھی۔ اس حقیقت کی روشنی میں یہ کہنا تو اک حد تک مبالغہ نہیں ہے کہ غالب اُردو اور فارسی کے بایائے لسان تھے بلکہ فارسی زبان کی گہرائیوں تک کے موتی غالب نے اپنے ذہن رسا کی رسن سے قعر عدم سے نکالے ہیں لیکن یہ ماننا ہی پڑیگا کہ غالب کو متداولہ علوم پر اکتسابا یا وہبی طور پر مکمل عبور نہ تھا۔ چنانچہ خود اسکا اعتراف غالب نے کیا ہے۔ جہاں غالب نے برہانِ قاطع پر اعتراضات کے سلسلے میں لفظ "افسوس" فارسی کو عربی الاصل ماخوذ از اَسف قرار دیا ہے۔ جو اگرچہ معنوی اعتبار سے افسوس جیسا ہی ہے لیکن اس غلطی کا خود غالب نے اعتراف کرلیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی کی ٹھوس بنیادی تعلیم کے گہرے نقوش غالب کی رسمی ابتدائی تعلیم میں نہ تھے جیسا کہ وہ خود اپنی فارسی کی ہمہ دانی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"فارسی زبان کے قواعد وضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر" بیشک مرزا کا فارسی میں یہی مقام تھا مگر افسوس یہی ہے کہ خود افسوس فارسی کو معرب بنا ڈالا کبریائی بجز ذاتِ حق کسے سزاوار! اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہندی فارسی دانوں میں بجز امیر خسرو اور آدھے فیضی کے کسی کو نہ مانتے جنمیں بیچارے قتیل و ملا غیاث کی کیا خطا اور یہ تمام تر اثر اسی ملا عبدالصمد کی تربیت کا تھا۔ خود غالب کو اسکا اعتراف تھا کہ ملا عبدالصمد علاوہ فارسی کے عربی تعلیم سے کما حقہ واقف

نہ تھا اور اسکا اثر ظاہر ہے کہ غالب پر اتنا ہی پڑ سکتا تھا کہ غالب عربی سے ناآشنائے محض نہ رہے وہ درجۂ اجتہاد جو ان کو اپنی فارسی میں تھا وہ اور چیز ہے حالانکہ اسوقت کا اسلامی تمدن اہلِ علم طبقے کیلئے عربی کی متداول کتابوں کی باقاعدہ تعلیم کے سوا نہ تھا چنانچہ درس نظامی میں کتب طب کا بھی شمول ہے طب پڑھ کر چاہے کوئی مطب کرے نہ کرے۔ ہر اہل علم خاندان میں اُردو کے بعد عربی کی تحصیل اور فارسی ادبیات کا ذوق وشوق لازمۂ تمدن تھا مگر خصوصی ماحول کے سبب غالبؔ اس صفت سے موصوف نہ تھے۔ سُسرال کی عارفانہ صحبتوں کے سبب تصوف سے آشنا ہوئے، عبدالصمد کی تعلیم، اور ہم صحبتی سے فارسی کی گہرائیوں پر عبور میسّر آیا۔

اب ہم غالب کے علمی ماحول پر روشنی ڈالنے سے پہلے اسکا علمی پوزیشن حالیؔ کی "یادگارِ غالب" کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔ یادگارِ غالب صفحہ ۳۴ "مرزانے قاطع برہان کے آخر میں چند فوائد لکھے ہیں ان میں سے فائدہ اول کا ماحصل یہ ہے کہ" ان فوائد کے پیش کرنے میں چونکہ خود نمائی کی بو آتی ہے اسلئے شاید لوگ یہ کہیں کہ خود ہندوستانی ہو کر دوسرے ہندوستانیوں کو مُسلّم نہ جاننا اور زباندانی کا دعویٰ کرنا بے معنی ہے، سو میں اقرار کرتا ہوں کہ میرا دادا توران سے آیا تھا اور میرا باپ دِلی میں پیدا ہوا اور میں آگرہ میں۔ حاشا کہ میں اپنے تئیں اہل زبان سمجھتا ہوں (اہلِ زبان فارس) میں بلاشبہ زباندان ہوں اور میری زباندانی اول خداد سلامتی طبع کی بدولت ہے جو غلطی کو قبول نہیں کرتی، اور بغیر سچائی کے تسلی نہیں پاتی۔ دوسرے اسوجہ سے کہ میری طبیعت فارسی زبان سے فطرتاً مناسب واقع ہوئی ہے۔ تیسرے یہ کہ ملا عبدالصمد کے فیض صحبت سے جو مجھ کو دو برس تک برابر حاصل رہا چودہ برس کی

عمر میں میں نے اس سے تربیت پائی اور اب باون برس مشق سخن کی۔ اب کہ مجھکو چھیاسٹھواں سال ہے میں خدا کا شکر کرتا ہوں اور خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا کہ ان باون برسوں میں اس نے کسقدر معنی کے دروازہ مجھ پر کھولے ہیں اور میری فکر کو کس درجہ بلندی بخشی ہے۔ افسوس کہ لوگوں نے میرے کلام کی خوبی کو نہ سمجھا اور زیادہ تر افسوس یہ کہ وہ شانِ ایزدی کی شناخت سے محروم رہے اور میری نظم و نثر کے کرشموں کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ گویا نظیری جنت آرامگاہ کا مقطع میرے حسب حال ہے ؎

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ "

اس بیانِ غالب کے بعد آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ غالب کے میدانِ علمی کا اشہبِ لیاقت فارسی زبان کے ادبی نکات کے میدان میں شہسواری کرتا تھا اور خیر یہ تو دیرینہ سالی کی پختہ کہنہ مشقی تھی، غالب کی تو وہ فطری صلاحیت تھی جسکو وہ بچپنے سے پیش کرتے آرہے تھے چنانچہ گیارہ سال کی عمر میں جب ملا عبدالصمد کی تربیت کا بھی واہمہ نہ تھا کہ وہ خود بقول غالب چودہ سال کی عمر میں میسر آئی۔ غالب نے اپنی کسی فارسی غزل کے اشعار میں "چہ" بمعنی "کہ" استعمال کیا جسکو اُن کے استاد شیخ معظم نے دیکھکر کہا کہ "یہ کیا مہمل ردیف اختیار کی ہے۔ ایسے بے معنی شعر کہنے سے کچھ فائدہ نہیں" مرزا، استاد کی یہ دھمکی سنکر حسب تقاضائے سن خاموش رہے، ایک روز خیر سے ملا ظہوری کے کلام میں ایک شعر اُن کی نظر پڑ گیا جسکے آخر میں لفظ "چہ" "کہ" کے معنوں میں آیا تھا کتاب لیکر

دوڑے ہوئے استاد کے پاس آئے شعر دکھایا وہ حیران ہو گئے اور مرزا سے کہا "تم کو فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے تم ضرور فکر سخن کیا کرو کسی کے اعتراض کی کچھ پرواہ نہ کرو۔" واقعی غالب کا "چہ" کا استعمال جو بڑھے ہوئے استعجاب کو ظاہر کرتا ہے کمال شعری پر دال ہے، پھر بعالم طفولیت اور یہی کمال استعجاب ظہوری کے یہاں "کہ" بمعنی چہ، کی صورت شعر میں شعور شعریت کا حامل ہے۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ملا عبدالصمد کی رہنمائی میں غالب نے فارسی کے غوامض اور انتہائی ادبی نکات پر سیر حاصل عبور کر لیا تھا کہ خود اس ایرانی تربیت سے پہلے غالب فارسی کے قادر الکلام اعلیٰ معیار کے بطرز بیدل مسلم الثبوت شاعر تھے۔ تو ظاہر ہے کہ اس ایرانی صحبت میں جیسا کہ ہمارا خیال ہے ملا عبدالصمد سے بھی ہمعصری کے انداز کی ہی غالب کو علمی صحبت رہی۔ خود غالب نے جسے "فیض صحبت" ہی کہا ہے تلمذ نہیں کہا ہے۔ مثل ہے کہ "علم بے بحث اور مال بے تجارت بڑھتا نہیں" سودی اضافہ کو بڑھنا کہنا یا سمجھنا قرآن نے غلط بتایا ہے بلکہ یوں کہا ہے سود لیکر مال نہیں بڑھتا اور زکوٰۃ دیکر مال بڑھتا ہے۔ غرضکہ ان صحبتوں کی افادی حیثیت تلمیذانہ کم ہے اور ہم عصری محققانہ زیادہ۔ چنانچہ جب غالب کا یہ بچپنا تھا تو پھر اس کی کہنہ مشقی کا کیا عالم ہوگا یہی کہ اسوقت دلّی کے جملہ اہل علم و اہل قلم سے غالب کا ہمعصری دوستانہ رابطہ تھا، جو ادبی محفلیں غالب کے یہاں اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے یہاں ہوتی تھیں ان میں غالب کے حلقہ ارادت والوں کی اکثریت رہتی، اور وہ سب اپنے وقت کے مانے ہوئے اہل علم، اہل قلم تھے جن کی تفصیل آگے آتی ہے۔

غالب کے مزاج میں چونکہ حد درجہ کی ظرافت تھی اور رہن سہن کے عادات واطوار نوابی شاہانہ تھے، چراغ گل ہوتے ہوئے ضرورت سے زیادہ بھڑککر گل ہوتا، سسرال کا گھرانہ بھی خود نوابی کے ٹھاٹھ کی آخری منزلوں میں بہار پر تھا۔ غالب نے گو عربی کی تعلیم باقاعدہ نہ حاصل کی ہو یعنی یہ ممکن ہے کہ حکیم مومن خاں مومن کی طرح غالب نے مطب نہ کیا ہو لیکن طبی مسائل سے، نیز بقدر کفایت عربی سے واقفیت ضرور تھی۔ اور شیخ محمد ابراہیم ذوق کی طرح اگر فقہ کے مسلہ مسائل نہ پڑھے ہوں تو بھی ان سے واقف ضرور تھے اسلئے کہ اسوقت دِلّی میں کرایہ پر کتابیں پڑھنے کا رواج تھا، ایک آدمی کتابیں لاتا، غالب بھی کتابیں اسی سے منگواتے اور پڑھ کر واپس کر دیتے۔ غرضکہ گھر بھی کرایہ کا اور کتابیں بھی کرایہ کی۔

غالب کے اشعار میں قرآنی اقتباسات "اِنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ" تک ملتے ہیں۔ جس سے ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ غالب نے خود کو بنانے میں اتنا مذاق سلیم بہم پہنچا لیا تھا کہ مفتی صدرالدین آزردہ، مولوی امام بخش صہبائی۔ شیخ ناسخ۔ حکیم مومن خاں مومن۔ شیخ ابراہیم ذوق اور مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے نادیدۂ روزگار عالم مولوی اسمٰعیل محدث شہید جیسے مجاہد اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ جیسے شگفتہ مزاج غالب کے ہم صحبت تھے۔ غالب فرماتے ہیں ؎

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود | باد در خلوت شاں مشک فشاں از دمِ شاں
مومن و نیّر و صہبائی و علوی وانگاہ | حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظمِ شاں

یہ قطعہ اسوقت کے اہل سخن کے علمی ماحول پر روشنی ڈالتا ہے جس میں غالب کی علمی دنیا پر جن کے اثرات غالب رہے ان میں آزردہ، مولانا فضل حق سے بھی

کچھ زیادہ ہی نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی ہستی ہے جن کے متعلق غالب کہتا ہے

غالب بہ فنِ ریختہ نازد بدیں ارزش کہ او
نہ نوشت در دیواں غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

انھیں مصطفےٰ خاں شیفتہ کے "تذکرہ گلشنِ بیخار" میں غالب کا ذکر بھی موجود ہے اور یہ وہی شیفتہ ہیں جن کے متعلق مولانا حالی فرماتے ہیں ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

یہ شعر ظاہر کرتا ہے کہ مولانا حالی جو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے بچوں کے اتالیق تھے، نواب شیفتہ سے مشورہ سخن کرتے ۔ وہ شیفتہ جو غالب سے اصلاح سخن لیتے اس تعلق سے حالی غالب کے حلقۂ ارادت میں تھے نہ کہ حلقۂ تلامذہ میں ــــ اس خاکسار بیدل کا کہنا ہے کہ یہ بھی مگر جب خود شیفتہ ہی غالب پر شیفتہ شاگردی میں ہیں تو ان کے شاگرد حالی تو تلمیذ التلامذہ میں آتے ہیں شاگردوں کے شاگرد کی فہرست میں ۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ حالی بھی نواب شیفتہ کی طرح غالب کے حلقۂ ارادت، حلقۂ احباب اور حلقۂ تلامذہ ہی میں ہیں خود عالم تھے اور شاعری کو ترک کر بیٹھنے کی جب سوجھی تو غالب ہی نے کہا کہ "اگر تم شاعری نہ کروگے تو فن اور قوم پر ظلم کروگے ۔ چنانچہ اکبر کے ساتھ حالی بھی انقلابی شاعر کہلائے ، اقبال جن کا لطیف امتزاج کہلائے ۔

غرضکہ اس ہمعصری استفادہ کی شانِ تلمذ، مکتبوں کی استادی شاگردی کی نہیں ہوتی ۔ چونکہ خود حالی غالب سے متعارف شیفتہ کی وجہ سے ہوئے تھے تو

یہ کیفیت جو اس شعر میں بیان ہوئی ہے وہ ان کے ابتدائی تاثر کو ظاہر کر رہی ہے۔ اگر آزاد، ذوق اور حالی، غالب کے نہ ہوں تو پھر کون کس کا شاگرد کہلانے کا مستحق ہے۔ اور فضیلت علمی میں چھوٹے بڑے کا کوئی سوال نہیں۔ امام الہند مولانا آزاد اپنی کم سنی میں اپنے والد کے بڑی عمر والے افغانی ملا شاگردوں کو جو ان کے ہم جماعت ہم سبق ہی تھے ان کا سبق دہرا دیا کرتے بلکہ پڑھا بھی دیا کرتے حقیقی معنوں میں تو یہ شاگردی ہی ہے مگر عرف عام اسے دوسرے زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ غرضکہ سر سید تک غالب کے حلقۂ ارادت و عقیدت میں نظر آتے ہیں۔

غالب، کے خطوط جن اسمائے گرامی کی فہرست پیش کرتے ہیں ان کا خود مطالعہ یہی ثابت کرتا ہے کہ "غالب کا علمی ماحول" اسوقت کے علماء، صلحا و فضلاء اور اہل قلم، اہل سخن کا ماحول تھا۔

مرزا کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کے برادر کلاں نواب احمد بخش خاں کے بیٹے جو بیگم جہاں کے بطن سے تھے۔ وہ ان کو بہ منزل حقیقی سالے بلکہ حقیقی برادر کے تھے۔ مرزا کی جب پینشن بند ہوئی تو یہی ان کے غمخوار اور مونس و ہمدرد اور کفیل تھے ان سے اور مرزا کو میر مہدی مجروح اور نواب ضیاء الدین احمد خاں سے خاص عقیدت تھی۔ اور نواب ضیاء الدین احمد خاں کو اور عارف کو مرزا اپنا جانشین سمجھتے تھے۔ ضیاء الدین احمد خاں کے بھتیجے نواب علاؤ الدین خاں بھی مرزا کے خاص متوسلین اور قریبی متعلقین میں تھے جن کی وجہ سے مرزا کی معاشرت علمیہ کا تعلق اک اونچے درجہ کی بلند اخلاق سوسائٹی سے وابستہ تھا جس کے افراد اور ارکان، ادب اور تمدن کی جملہ اقسام میں ایک خاص مقام اپنا رکھتے تھے۔

حلقۂ احباب

حلقہ احباب میں یوں تو وہ سب ممتاز ہستیاں ہیں جن کے متعلق غالبؔ کے خطوط ملتے ہیں لیکن اُن میں کی ممتاز ترین شخصیتیں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ مولانا فضل حق خیر آبادی۔ مفتی صدر الدین آزردہ۔ مولوی نبی بخش حقیر، خصوصی تعلق کی مستحق ہیں۔ عام حلقۂ احباب میں سے جو غالب کے زیادہ قریب نظر آتے ہیں یہ ہیں نواب میر غلام بابا خاں رئیس سورت۔ منشی سیف الحق میاں داد خاں سیاح سورت۔ مولوی منشی حبیب اللہ خاں ذکاؔ۔ چودھری عبد الغفور سرورؔ۔ شاہ عالم مارہرہ۔ صاحب عالم مارہرہ۔ نواب انور الدولہ سعاد الدین خان بہادر شفقؔ رئیس کالپی۔ میر سرفراز حسین۔ مولوی عبد الغفور خان بہادر نساخؔ۔ قاضی عبد الجلیل مردان علی خاں رضاؔ۔ مولوی عبد الرزاق شاکرؔ۔ مولوی عزیز الدین صاحب۔ مفتی سید محمد عباس صاحب۔ عضد الدولہ حکیم ظہیر الدین احمد خاں۔ مسیح الملک اول حکیم محمود علی خاں صاحب رئیس اعظم دہلی۔ مرزا حاتم علی مہرؔ۔ حکیم سید احمد حسین مودودی۔ خواجہ غلام غوث بیخبرؔ۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں۔ مرزا شہاب الدین احمد خاں۔ افضل علی۔ مرزا قربان علی بیگ خاں سالکؔ۔ مرزا شمشاد علی رضوانؔ۔ مرزا باقر علی کاملؔ۔ ذو الفقار الدین حیدر خاں عرف حسین مرزا۔ یوسف مرزا صاحب۔ منشی شیو نرائن صاحب۔ میر احمد حسین صاحب۔ ماسٹر پیارے لال۔ نواب امین الدین احمد خاں صاحب بہادر رئیس لوہارو۔ مرزا علاء الدین احمد خاں صاحب۔ مرزا امیر الدین احمد خاں عرف فخر و مرزا۔

منشی جواہر سنگھ جوہر۔ نواب یوسف علی خاں بہادر۔ اور نواب کلب علی خاں بہادر والئ رامپور وغیرہ وغیرہ۔

نوٹ۔ تسمیہ (نام رکھ لینا) بھی لامناقشۃ فی الاصطلاح جیسی چیز ہے آپ جو بھی نام رکھنا چاہیں رکھ لیں مگر اثرالاسم یظہر فی المسمیٰ، نام کا اثر مسمیٰ پر ضرور پڑتا ہے اسی لئے حدیثوں میں آتا ہے کہ نام اچھے رکھنے چاہئیں۔ یہاں ذوالفقارالدین حیدر خاں عرف حسین مرزا، ایک نام آیا ہے جس کی ترکیب ناقابل فہم ہے یعنی نام کا یہ حصہ ذوالفقارالدین جسکو نہ مرکب توصیفی کہا جاتا ہے نہ مرکب اضافی کہہ سکتے ہیں اہل علم اس سقم کو سمجھتے ہیں مگر نام ہے اور یہ مقام بحث کا نہیں۔ اور اسکی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ ذوالفقار ایک لفظ ہے اسلئے مضاف بنا اور پیش بھی اسپر درست رہا ورنہ مرکب اضافی ہوتا تو زیر آتا اور پھر بھی الف لام نہ آسکتا کہ مرکب اضافی درا ضافی ہوتا اب سادہ لقب ہے حضرت علیؓ کی تلوار کا اور مضاف ہے۔

اگرچہ تلامذۂ غالب کی فہرست چھپ گئی ہے مگر اسے حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مکمل ہے اس کے علاوہ غالب کے زمرۂ تلامذہ میں اور کوئی فرد نہیں جس وقت ہم نے اسکا مطالعہ کیا تھا ہماری ہی یادداشت میں کچھ نام اور کھٹکے تھے مگر مخصوص حلقۂ تلامذہ میں مہر جہاں بجروح۔ ہر گوپال نرائن تفتہ۔ اور علامہ الطاف حسین حالی ہیں۔ گو حالی کہتے ہیں کہ وہ غالب کے معتقد ہیں تو اسکی توجیہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں نیز یہ تو اردو شاعری کے تعلق سے کہا گیا ہے لیکن دیوان غالب فارسی کے اکثر مقامات حالی نے غالب سے پڑھے ہیں اور حالی، غالب کے چہیتے متوسلین میں سے ہیں جن کی "یادگار غالب" نے غالب کی زندۂ جاوید تصویر کھینچ کر دینے سے

غالب کو روشناس کرایا۔ خدا ہر صاحب جوہر کو ایسے شاگرد نصیب کرے اگر حالی
غالب کے حق میں متعارف نہ ہوتے تو آج دنیا غالب کو اس حیثیت سے نہ بوجھ سکتی۔
اور یہ تصور جو لوگوں کے ذہن میں آج غالب کا ہے کسی عالم خیال میں بھی جنم نہ لے سکتا
آزاد نے علامہ ذوق کی استادی کا حق ادا کرنے میں آب حیات میں پینتیس صفحے
کالے کئے جبکہ غالب کو بمشکل اڑھائی صفحے بخشے۔ قدرت کو یہ بے اعتنائی پسند
نہ آئی اور سروش محرک ہوا کہ حالی اُٹھے اور "یادگار غالب" جیسی نادر تصنیف اپنے
استاد کے حق میں لکھ ڈالی۔ غالب کے متعلق جن بنیادی شاہراہوں کو حالی نے
اپنی اس کتاب میں سمجھایا سجھایا وہ بذات خود اک سنگ میل کا کام دے رہی ہیں۔
جبتک، جتنا اور جسقدر ریسرچ غالب کے متعلق ہوا یا ہو رہا ہے یا ہوگا وہ سب
اپنا بنیادی ماخذ اسی "یادگار غالب" کو بنائینگے۔ جس نقد و تبصرے کے ساتھ
حالی نے یہ چیز پیش کی ہے جہاں غالب کے علمی چہرے کی نقاب کشائی ہے وہیں
فنی حیثیت سے اردو زبان میں غالب کی بدولت وہ انمول انوکھے نقد و تبصرہ
کے طرز بیان کا فن تنقید میں اضافہ ہوا ہے کہ اس کتاب کو سامنے رکھ کر دوسرے
فنکاروں کے بارے میں بھی اہل قلم بہت کچھ لکھ سکتے ہیں جس کا اردو ادب بیحد
ممنون ہے اور اس کا سبب غالب مرحوم ہے۔

جوانی کے مشاغل

یہ حقیقت امر مبرہن ہو چکی ہے کہ غالب نے سات آٹھ سال کی عمر سے اردو
میں شعر کہنے شروع کر دئے تھے۔ معمولی شعر و شاعری اور مروجہ غزل گوئی سے

گزر کر مسلسل نظمیں تک اس دور کی یادگار رہیں بلکہ کثرت اظہار وایجاد اور انشاد پر بہت سی ذہن سے فراموش بھی تھیں جن کی تصدیق اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے "منشی بہاری لال مشتاق کا بیان ہے کہ لالہ کنہیا لال ایک صاحب آگرہ کے رہنے والے جو مرزا صاحب کے ہم عمر تھے ایکبار دلی آئے اور جب مرزا سے ملے تو اثنائے کلام میں انکو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپنے پتنگ بازی کے زمانہ میں لکھی تھی وہ بھی یاد ہے؟ مرزا نے انکار کیا تو لالہ بولے کہ وہ مثنوی میرے پاس ہے۔ چنانچہ انھوں نے مرزا کو وہ لا کر دی، مرزا اسے دیکھکر بہت خوش ہوئے۔ اسکے آخر میں یہ فارسی شعر کسی استاد کا پتنگ کی زبانی لاحق کر دیا ہے

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
میکشد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

ہمیں می کشد کی جگہ می برد، یاد پڑتا ہے۔ لالہ صاحب کا بیان تھا کہ مرزا کی عمر جب یہ مثنوی لکھی آٹھ نو برس کی تھی۔ تو جب کلام کی یہ پختگی کا اس عمر میں یہ عالم ہو کہ بڑھاپے میں بھی اسپر نظر ثانی کی ضرورت نہ محسوس ہوئی تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کی مشق سخن کہیں پہلے سے شروع ہو چکی تھی وہی افتتاحی مکتبی تعلیم سے سمجھی جائے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ نظمیں جو مسلسل کسی خاص چیز پر مرزا کے قلم سے ٹپکی ہیں ان کو مثنوی مجازاً کہدیا گیا یہی وجہ ہے کہ یہ چیز مرزا کی طبیعت سے اتری ہوئی تھی کہ یاد دہانی کے باوجود یاد نہ آئی جبتک کہ آنکھوں سے نہ دیکھی اور ایسی کتنی نظمیں نہ ہونگی جو بچپنے کی یاری میں بانٹ دی گئی ہونگی کہ پھر ان کا کہیں ذکر و مذکور بھی نہ آیا ہو۔

پھر فارسی شعر و شاعری کا دور بھی دس گیارہ برس کی عمر سے کہیں پہلے ہی شروع ہو گیا تھا کہ ہم لکھ چکے ہیں "گیارہ سال کی عمر میں غالب نے ایک فارسی غزل جس میں یہ بمعنی کہ ردیف تھی مولوی محمد معظم کو دکھائی جس پر وہ بولے کہ یہ مہمل ردیف کہاں سے استعمال کی وغیرہ۔ پھر جب ملا ظہوری کے کلام سے استناد پیش کیا تو استاد قائل ہو گئے" وغیرہ۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ غالب اس عمر میں فارسی کے میدانِ شاعری میں بھی تیز دوڑ رہے تھے اور وہی اپنی فطری انوکھی استعداد پر وہ چیزیں جو ہمعصر ادیبوں شاعروں کی نظروں سے اوجھل تھیں بروئے کار لانے لگے تھے۔ جن پر وہ بیچارے اپنی بساط کے بموجب معترض رہے۔ تبھی تو استاد نے کہا کہ "تم کسی کے اعتراض کی پرواہ نہ کرو" اور شعر کہتے رہو۔ یہ بات پھر بھی ملاحظہ رہے کہ ابھی عبدالصمد کی اتالیقی کا دور نہیں آیا تھا کہ وہ چودہ برس کی عمر کی یادگار ہے۔

غرضکہ غالب نہایت ہی کم عمری میں آگرے سے دہلی آنے لگے تھے اور شادی کے بعد جو خود تیرا سال کی عمر میں ہوئی یہ آمد و رفت اور بڑھ گئی پھر، ادس ترہ سال کی عمر میں تو مستقل سکونت دہلی میں خانہ داما دی کی حیثیت سے اختیار کر چکے تھے۔

مرزا کے خسر نواب الٰہی بخش اور ان کے بھائی احمد بخش یہ نہایت عمدہ شعر گو اور شعر فہم، شعر نواز۔ نوابی میں فقیر منش گھرانے کے تھے۔ غالب کے خسر نے اپنے طریقہ سلوک میں غالب کو رنگنا چاہا کہ وہ بچپنے کی رندی لاابالی کچھ کم ہو۔ لیکن غالب کی رندیت پر یہ رنگِ معرفت نہ چڑھا۔ غالب کو خسر نے وحدت مزاجی کی پہلی راہ و رسم کے لئے اپنا خاندانی شجرہ طریقت نقل کو دیا۔ شجرہ کی نقل کی خدمت جب غلط سلط غالب نے پیش کی قصداً کہ آئندہ کو ہمیشہ کیلئے چھٹکارہ ملے یا ممکن ہو کہ

غیر ارادی طور پر ایسا ہوا کہ غالب کا فطری رجحانِ طبع نہ تھا تو خسر بیچارے کنارہ کش ہو گئے۔ پھر کیا تھا غالب "مخلّی بالطبع" ہو کر نوابی ٹھاٹھ کی زندگی دہلی کے عمائدین رؤسا و شرفا میں گزارنے لگے۔ آگرہ کی وہ عادتیں جن کا تعلق بٹیر بازی، کبوتر بازی۔ پتنگ بازی، مُرغ بازی وغیرہ سے تھا ان مشاغل نے شطرنج، چوسر کا چولا پہن لیا جو اسوقت کے امراء کے یہاں بطور لازمۂ تمدن نشانِ شرافت تھا اور سبھی کم و بیش اس رنگ میں مخمور رہتے کہ مجبور مگر وقت کا تقاضا تھا اسکے باوجود اسوقت اگرچہ مغلیہ سلطنت انگریزوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی تھی۔ پھر بھی ملک و قوم خواہ ہندو خواہ مسلم، انگریزوں کو غدّار، غاصب اور شاہ ظفر کو قابلِ مرحمت لائق ستائش معصوم جہاں پناہ، ظل اللہ سلطان تصور کرتی تھی۔ علمی حلقے، شعر و شاعری کے مجمعے، فارسی شاعری کے مشاعرے نہایت آب و تاب سے دہلی میں منعقد ہوتے جن میں مرزا اپنی سسرال کی اعلیٰ پوزیشن کے سبب شرکت لازمی سمجھتے۔ چنانچہ ایک فارسی مشاعرے کے لئے مرزا نے ایک بہترین فارسی غزل لکھی لیکن مفتی صدرالدین آزردہ کے آنے میں دیر ہوئی تو افسوس کرتے رہے کہ پڑھوں نہ پڑھوں۔ مفتی صاحب کچھ دیر سے آئے اور غالب نے اپنی غزل محفل کو سنائی کہ ایک اہل علم ان کے خیال کے مطابق سننے والا تھا اکثر ایسا ہوتا کہ ان کے حسبِ مزاج کوئی لائق ہستی مشاعرے میں دکھائی نہ دی تو غزل پڑھے بغیر واپس چلے آتے۔

سُسرال کے علمی وقار کا دہلی میں سکہ بیٹھا ہوا تھا اور غالب کی سبھی قدر منزلت اس تعلق سے کرتے بھی تھے۔ لیکن اس کا کیا کیجئے کہ غالب کی افتادِ

طبع ہی انوکھی تھی جو عام فہم تھی نہ عوام پسند۔

غرضکہ غالب کے مشاغل میں شراب و کباب کے ساتھ علمی سرگرمیاں بھی برابر کی حصہ بردار تھیں۔ غالب جب بھرت پور کو اپنے چچیرے خسر کے ساتھ جا رہے تھے تو ان سے یہ خواہش کی گئی کہ اپنے ایسے اشعار جو بطور ضرب المثل خطوں میں استعمال ہوں۔ لکھدیں تو انھوں نے اپنے فارسی کے وہ اشعار جو زینتِ مضمون مکتوبات کے لئے بن سکتے ہیں اور ہر قسم کے آداب لکھدئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت خطوط نویسی کی انشاء پردازی کا میدان فارسی تھا۔ اور غالب کی عمر تک بھگ پچیس سال کے تھی اور ان کا اردو کا موجودہ دیوان اس کے بعد چھپا۔ اور مزید تقریباً پچیس سال تک یعنی غالب کی عمر کے پچاس پچپن سال تک غالب کا مذاق شعری فارسی میں جولانی طبع دکھا رہا تھا۔

اس خصوص میں غالب کی پینشن کا بند ہونا، ان کا کلکتہ جانا وہاں کا قیام اور مرزا قتیل کی کتابوں پر ادبی چشمک کے سبب یہ ان کا اردو مذاق، فارسی میں گم ہو رہا قلعۂ معلّٰے میں بیشک اردو کا طوطی بول رہا تھا لیکن وہاں غالب کی باضابطہ رسائی نہ تھی، استاد ذوق کی ہمعصرانہ چشمک نے ان کے حین حیات، غالب کو متوسلین شاہ سے نہ ہونے دیا۔ اسمیں خود غالب کے اپنے ماحول کو بھی کافی دخل رہا جسکا سرسری ذکر اس سے پیشتر کیا جا چکا ہے کہ غالب ممنون و مرہون انگریزوں کے اپنے پیدا ہونے سے پہلے ہی ہو چکے تھے، اب جسکا کھانا اسیکا گانا، عمر بھر انکی مدح سرائی میں جھک مارا۔ قلعے کے ادبی اردو مشاعروں میں غالب کی شرکت ذوق کی موجودگی میں ہوتی تھی لیکن وہ قابل اعتناء نہ سمجھی گئی۔ غالب کو دنیائے ادب اسوقت فارسی کا

فنکار سمجھتی تھی، چنانچہ ۱۸۵۰ء میں جب غالب کے دوست حکیم احسن اللہ خاں مدار المہام نے غالب کا تعلق قلعۂ معلیٰ میں ملازم کی حیثیت سے مورخ شاہی کے منصب کی تقرری پر کرانا چاہا تو اسوقت یہی چیز سب کے سامنے تھی کہ غالب کی یہ نثر نگاری فارسی کی ایک نثر کار فن کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ مہر نیمروز لکھنے کی خدمت غالب کو ملی۔

غدر سے بارہ برس پہلے ۱۸۴۵ء میں استاد ذوق کا بھی انتقال ہو چکا تھا، بادشاہ کو اصلاح سخن کے لئے بھی استاد کی ضرورت تھی تو غالب کو شاہی مورخ کے ساتھ استاد شاہ ہونے کا بھی فخر حاصل ہوا تو یہ زمانہ غالب کی عمر کے دو حصے گذر جانے کے بعد کا ہے۔ اسوقت غالب نے قلعۂ معلیٰ کا رنگ اور بادشاہ کی طبیعت کا رجحان اردو اور وہ بھی سہل اردو دیکھا تو مجبوراً اپنی طرز روش کو بدلا۔ اگرچہ مولوی فضل حق وغیرہ جیسے مخلصوں کے اخلاص کا اصرار بھی اک عرصے سے اس تبدیلی کا محرک اول تھا۔

غالب کو اب مہر نیمروز لکھنے میں جو فارسی کی جولانی طبع دکھلانیکا موقع ملا تو اب اسمیں مزید اتنی سکت باقی نہ رہی تھی کہ فارسی کے خطوط کا سلسلہ بھی باقی اور جاری رہتا چنانچہ وہ خود کہتا ہے کہ "اب مجھ میں وہ پژوہش باقی نہیں کہ فارسی خطوط نویسی کے بار کا متحمل ہو سکوں"۔

اس سے معلوم ہوا کہ غالب میں انانیت، خودداری، اپنی شخصیت کا احساس حد درجہ کا تھا، چنانچہ غالب کی زندگی کے جستہ جستہ واقعات اسکی تائید میں بکثرت ہیں۔ قدرے ملاحظہ ہوں۔ ملازمت سرکاری سے انکار۔ جوسر شرط بدکر کھیلنے

میں گرفتار ہونے کو غالب اپنی ہتک کا ناسور عزت سمجھتے تھے۔ اس گرفتاری کے بارے میں ہم پہلے لکھ چکے ہیں، ممکن ہے کہ کوتوال کو اپنے ذاتی عناد میں اس قانونی جرم کی دھمکی دینے کی بھی نوبت آئی ہو اور مزید تائید قرض کی عدم ادائی پر مہاجن کو اغوا کر کوتوال اور دوسرے حاسدوں کو ملی ہو ورنہ گرفتاری وہی ایکمرتبہ کی قرضہ کی ڈگری پر ہوئی تھی اور حسد میں ہوئی تھی۔

غرضکہ بہت مجبوری کے حالات غالب کو پیش آئے جن کی بدولت غالب نے فارسی شاعری اور فارسی خطوط نویسی ترک کی اور وہ بولی جسکو وہ بولتے تھے اسمیں قلم برداشتہ بیساختگی سے خطوط نویسی جب شروع کی تو اپنی تمام گرمی طبع بصورت ظرافت خطوط میں بھرنے لگے۔ ادھر قلعۂ معلےٰ کے غیر ارادی تقاضے اردو شاعری بھی کراتے رہے۔ یہی وہ غیر ارادی چیزیں آج غالب کی شانِ امتیاز کو پبلک سے دوچار کرانے کی واحد ذمہ دار ہیں۔ غالب مرحوم اسکا احسان مانیں یا نہ مانیں چنانچہ ان کے ہمعصرانہ تعلقات پر روشنی زیادہ تر ان کے انھیں اردو خطوط سے پڑتی ہے۔ غالب اگرچہ اپنے وقت کے ایک البیلے جوان، نوابی ٹھاٹھ کی پوری لتوں کے ساتھ نشوونما پائے ہوئے تھے۔ مگر یہ تمام چیزیں ان کی جو یہ آگرہ سے دہلی اپنی ساتھ لائے تھے، شعر ان کے خاندانی علم و معرفت کی برکتوں میں مدغم ہوگئی تھیں، اور تھی بھی تو انھیں لوگ بہت کم باور کرتے تھے۔ اور تھیں فی الحقیقت بہت کچھ۔ اور اکثر ان میں سے ؎

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ　　تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

کا روپ لے چکی تھیں۔ اگرچہ شاہ ظفر نے پھر بھی یہی کہا تھا کہ ہم تو جب بھی نہ سمجھتے۔

مگر غالب نے اسپر یہی کہا کہ حضور تو اب بھی سمجھتے ہیں ۔ ولایت کیلئے تو عرفان کے بہت سے ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں۔ پھر بھی قسمت مساعدت کرے نہ کرے۔ کتنے گمراہی کے پڑاؤ درمیان میں پڑتے ہیں۔ ترک شراب نوشی تو اک امر شرعی ہے یا پھر یہ اجتناب محض اک وصف انسانیت ہے اور ولایت عرفان ایک اعلیٰ اخلاقی کردار اور کافی ریاض چاہتی ہے۔ یہ ریاض اک مدت کا لازمی ہے۔ بہرحال یہ شعر غالب کی پوری جوانی کے مشاغل کا آئینہ ہے کہ غالب کو سوائے دخترِ رز کے اور کوئی شغل بجز شاعری کے نہ تھا۔ دامنِ عصمت ہمہ قسم کی لغزشوں سے پاک تھا اور یہ دونوں چیزیں مرتے تک ساتھ رہیں ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ایک اور جگہ کہا ہے شُرب خمر کی حمایت میں ع

اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

اور فرمایا ہے ع

بنتا نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

نیز کبھی کبھی چوسر، شطرنج سے تفریح طبع کر لیتے۔ چوسر تو نرا جوا ہے۔ البتہ شطرنج اک شاہی دماغی ورزش ہے اور اس شاہانہ کھیل کو نوابی کا اک لازمہ تصور کیا جاتا تھا جو بنظر نقص و عیب نہ دیکھا جاتا تھا۔ خود امام شافعی کے یہاں اسکا جواز تشحیذ اذہان، سرعتِ فہم پر بتایا گیا ہے۔ لیکن ہمارے استاد علامہ انور شاہ کشمیری کہا کرتے تھے۔ تین شین بے کار :- شعر شطرنج شکار۔ اور

خود عربی فارسی میں شعر کہہ لیتے۔ اور اس "جوانی دیوانی" کے رومانی اشعار جو کلامِ غالب میں ملتے ہیں سو اس کے متعلق یہی کہنا ہے کہ ہر زمانے کے ادبی تمدن کا دارمدار غزل پر رہا ہے۔ قصیدے۔ رباعی۔ مثنوی وقتی ضروریات یا دفع الوقتی کی چیزیں ہیں۔ اور غزل کہتے ہیں صنفِ نازک سے رومانی باتیں کرنا۔ یہ جذبہ اک فطری ہے ہر زبان اور ہر زمان میں اس کا پایا جانا لوازماتِ زندگی سے ہے۔ اس کا ہر بیت ہر شعر ایک مستقل داستانِ حسن کو لئے رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ غزل میں اگر ہر دو مصرعہ بھی دو مختلف کردار کے حامل ہوں تو آخر وہ بیت بمعنے گھر ہے۔ گھر میں کمروں سے مختلف کام وابستہ ہوتے ہیں، وہ بدرجۂ احسن قابلِ تحسین ہیں، اور تنہا ایک شعر بھی فرد کہلاتا ہے کہ اپنی انفرادیت کی افادیت کا حامل ہے ورنہ عام طور پر ہر شعر ایک کیفیتِ حسن کو پیش کرے تو شعر غزل کا ہے دو شعروں میں کوئی واحد جذبہ ادا ہو تو قطعہ بند ہے۔ غرضکہ فارسی ادب کا روپ جب اُردو شاعری نے اپنایا تو اس کے لئے یہی میدانِ غزل کام آیا کہ ادبی تقاضے اس میں پورے ہوتے ہیں۔ اگرچہ اسکا موضوع وہی عشق و محبت کی رمزیں ہوتیں مگر ان کے لئے عفت پاکدامنی لازمی شئے رہتی ؎

میانِ عاشق و معشوق رمزیست کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

جن کا سراپا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خیر فارسی زبان تو اک معجون مرکب شئے ہے جس میں تذکیر و تانیث بھی نہیں۔ مگر اُردو شاعری میں اس جنسی میلان کے لئے جو زبان استعمال ہوئی ہے اس میں معشوق ہمیشہ مذکر رہا۔ یہ کوئی خدانخواستہ کسی غیر فطری جذبۂ بہیمیت کی نشاندہی نہیں ہے۔ اُردو شاعری امرد پرستی سے ہمیشہ پاک

رہی ہے مگر بتقاضائے حیا صنفِ نازک کو مردانہ لباس میں پیش کیا ہے۔ یہانتک کہ جب خود صنفِ نازک نے شاعری کی تو اس نے بھی اپنی نسوانیت کو عشق کی مردانگی میں ملبوس رکھا جس کا مذکر معشوق تو خیر ایک حقیقت ہے مگر عورت شاعرہ نے اپنے لئے نسوانی صیغے کبھی استعمال نہیں کئے نہ اس کے تخلص سے کبھی اس کی نسائیت پر روشنی پڑی۔ ان حقائق کے پیشِ نظر زمینِ غزل میں جو اظہارِ کیف ہوتا ہے اس میں داخلیت ضرور ہوتی ہے واقعہ کا ہونا نادرات سے ہے سبھوں کے شعری معشوق فرضی ہوتے ہیں شاعر ہو کہ شاعرہ۔ ورنہ بحرانِ عشق میں کیسے تال سُر اور وزن قافیہ کی سُدھ بدھ ہوتی ہے۔ اب غالبؔ کی پوری وہ غزل آپکے سامنے ہے جس کے اشعار سے غالبؔ کے ناجائز تعشق کو ہوا دی گئی ہے حالانکہ غالبؔ اک رندِ مشرب شرابی شاعر تھے کوئی صوفی، مُلا، محدث، مفسر، فقیہہ نہ تھے نہ کوئی شیخِ طریقت سجادہ تھے اور نہ ہی امام و واعظ تھے۔

غالبؔ کی رُومانی غزل

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال (؟)

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں تھی پائیداری ہائے ہائے

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی | اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال | دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا | دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے
کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال | ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے
گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال | ایک دل تس پر یہ نا امیدواری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

ان اشعار سے خود یہی ثابت ہوتا ہے کہ غالبؔ کے جائز کہ ناجائز بازاری عملی تعلقات نہ تھے بلکہ طرفین سے میلانِ طبع تھا اور وہ بھی محبوبہ کی قبل از وقت رحلت سے ختم ہو گیا اور بحیثیت ایک شاعر کے یہ ممکن ہے کہ جب حسن کی خیالی دنیا میں یہ لوگ زمین کے قلابے آسمان سے ملاتے ہیں تو غالبؔ نے بھی حسبِ دستور کسی رواجی فرضی معشوقہ کے خیال میں یہ اشعار کہے ہوں یا پھر زیادہ سے زیادہ اگر اس کی صحت کی خواہ مخواہ کی ذمہ داری بھی تسلیم کر لی جائے تو اس سے وہی شاعرانہ جنسی میلانات کا اظہار ہے نہ کہ تعلقات کا میرے خیال میں اس کا اک پس منظر ہے یوں تو سبھی غزل میں سبھی کچھ رومان کی خیالی دنیا میں پیش کرتے ہیں مگر وہ رومان خارجی کیفیات کا حامل ہوتا ہے اور بالواسطہ ذہن کو مرعوب و متاثر کرتا ہے مثل ہے ذکر العیش نصف العیش داخلی و محاکاتی کیفیات کا فقدان اردو شاعری میں کچھ تو عادتی رواجی شرم و حیا کے سبب رہتا آیا ہے اور کچھ اس اندازِ بیان پر اظہارِ بیان عدمِ قدرت کی صورت میں بھی پایا گیا ہے۔ اسی لئے اردو شاعری

میں عملی مغالطہ کی گنجائش کم ہے۔ "اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی"۔ یہاں غالب کی
محاکاتی طرزِ ادا نے جو منظر اصل روپ کا پیش کیا ہے وہی سبب اشتباہ ہے مضمون
کے تسلسل نے مزید اس شبہ کو اُچھالا جس پر شراح نے سفوات سے کام لیا اور دُور از کار
واقعات گھڑ لیے جو غالب کی خود افتادِ طبع ع "مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا" کا
نتیجہ تھے اور ہر بڑی شخصیت کے یہاں اس قسم کی سہل انگاریاں بہت کچھ گل کھلا چکی ہیں
علامہ شبلی کے خطوط عطیہ کے نام، بھی اسی زمرے میں ہیں پھر غالب جب ایک رندِ شرابی
ہی ٹھیرے۔ کوئی کعبے کے قاضی مفتی، قائدِ ملت تو تھے نہیں ان کے اس ناکردہ جرم
کو اتنی وقعت کیوں دیگئی۔ طوائف کے یہاں آنا جانا اور اپنی اولاد کو لیکر جانا ادب
آموزی کیلئے خود اس وقت کا تمدن تھا۔ "امراؤ جان ادا" میں مرزا رسوا نے یہی تمدن
تو پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جوانی میں غالب کا کسی طوائف کے یہاں جانا آنا بھی
تھا سو ممکن ہے کہ وہ بھی اسی اشتباہ پر ہو ہم نے غالب کی جوانی کی تصویر دیکھی ہے
چمپئی رنگ نکلتا قد ریش ندارد نوابی چہرے مہرے سے ٹپکتی ہوئی کوئی طوائف
لٹو بھی ہو جائے تو کیا عجب اور کہاں کی ندرتِ وحشت۔

غالب کی معصومیت

بہر حال ہمارا یہ کہنا ہے کہ ہم اول تو کسی شخصیت
کو ادبی پہلو سے پیش کر رہے ہیں نہ کہ تقوے دینداری
کے لحاظ سے، دوسرے یہ کہ ہم غالب کی زندگی کے اس دور میں اسوقت کے اعلیٰ سے
اعلیٰ عمائدین کی شرکت پاتے ہیں غالب چونکہ انگریزوں کے حلیف نمک خوار پنشن
پر تھے اس سلسلے میں خاندانی دیرینہ مراسم انگریز دلی سے وابستہ تھے وہ روزانہ اور
ہفتہ وار انگریز افسروں سے صحبت رکھتے اور پھر نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، نواب

ضیاءالدین احمد خاں - مولانا فضل حق خیر آبادی ،مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا شاہ نصیرالدین عرف کالے میاں اور خود پیر و مرشد شہنشاہ سراج الدین ظفر جیسے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور ان سے غالب کے ہم عصرانہ برادرانہ مخلصانہ مراسم دوستدارانہ یگانگت کے تعلقات تھے قلعہ کی حاضری بھی ہر ہفتہ چند مرتبہ پھر چل کر روزانہ بعد صبح کے ناشتہ کے دس بجے تک لازمی ہوگئی تھی - ایسے ماحول میں ناممکنات سے ہے کہ غالب کی انفرادی رومانی زندگی کسی اخلاقی سقم کی مرتکب رہی ہو جبکہ شب و روز کے آٹھوں پہر سب کی نگاہوں میں ہوں -

بہر حال ہمیں تو ادبی پہلو سے یہ دیکھنا ہے کہ وہ غالب جس کی پیدائش ۱۷۹۷ء کی جس نے سات آٹھ برس کی عمر میں اردو شعر کہنے شروع کئے ۲۵ سال کی عمر میں صاحب دیوان ہوئے گیارہ سال کی عمر میں فارسی شعر کہنے لگے - اردو کے اشعار کی تعداد ان کی زیادہ سے زیادہ ۱۷۰۰ تک ہے جن میں غزل کے ۱۱۹۸ باقی قطعات رباعی، مثنوی وغیرہ کے - اس کی زندگی کی انفرادیت کیا ہے - غالب نے اپنی عمر کے بہترین زمانے میں اردو شعر بہت کم کہے ہیں - غالب کی جوانی شیراز و اصفہان ہی کے خارزاروں میں بھٹکتی رہی - ژند و پاژند کی زبان ہی میں گل کاریاں کرتی رہی اور گیارہ بارہ ہزار شعر زبان پارس میں غالب نے چھوڑے جن کا زیادہ حصہ جوانی کا ہے - اور اپنی گنگا جمنا کی آبیاری کے لئے کچھ بچپنا باقی وہی بڑھاپے کی کچھ یادگاریں رہیں ،مگر معصومانہ اس لئے کہ بچپن اور بڑھاپا عصمت ہی کا دور ہوتا ہے اور غالب کی یہی معصومیت وجہ شہرت ہے -

غالب ہی بابائے تنقید ہیں

برہان قاطع پر اعتراضات قیام کلکتہ کے

زمانے میں غالب نے "غم نداری بز بخر" ایک مصیبت کا مشغلہ مول لیا اور پھر جو یہ آگ سلگی تو بجھتے بجھتے غالب کی جوانی کا چراغ ہی ٹمٹماتا بجھنے لگا تھا۔ بات یہی ہے کہ لوگ حقیقت سے زیادہ تقلید کو پسند کرتے ہیں کہتے ہیں کہ قبضہ سچا دعویٰ جھوٹا۔ چنانچہ اسی وقت ایک مقلد غیر مقلد کا جھگڑا دلی کی علمی دنیا میں اک معرکتہ الآرا مشغلہ تھا ایک طرف سید احمد شہید بریلوی اور ان کے معتقد اسماعیل شہید محدث دہلوی حامیانِ عدم تقلید تھے۔ جن کے ہواخواہ سرسید جیسے پرستارانِ نیچر بھی تھے۔ بیچارے فضل حق خیرآبادی کی دوستی کے دباؤ میں بادلِ نخواستہ تقلید کی دعوت پر غالب کا زورِ قلم بھی لبیک کہہ اٹھا۔ اور ساری عمر بھر کی آزاد منشی کی حریت کدہریت دھری کی دھری رہ گئی۔

بہرحال جو اعتراضات زبان وادب کے غالب نے اپنی جبلی فارسی دانی کے بل بوتہ پر اس وقت کی مروجہ فارسی پر کئے وہ آجتک کسی سے اٹھائے نہ اٹھ سکے اور آج کی تحقیق میں اہل زبان نے انھیں صحیح تسلیم کیا ہے یہ اور بات ہے کہ تنقید کے میدان میں جہاں اردو تنقید نگاری میں آپ سرسید کو بابائے تنقید مانیں وہیں اردو کے اس امام نقاد غالب کو فراموش کرجائیں غرضیکہ غالب کا خداداد وہ غضب کا حافظہ تھا کہ جس کتاب کو ایک مرتبہ پڑھ لیا وہ حافظۂ دماغ میں محفوظ رہگئی یہی چیز آئندہ چل کر اعتراضات کی شکل میں غالب نے پیش کی اور چونکہ وسطِ جوانی کے ایام میں غالب کو وہ بہوتیں جو ابتدا جوانی میں تھیں نہ رہیں اس کے سبب غالب کے علمی مشاغل اور مستحکم ہوگئے فنی استغراق اور مطالعہ کے لئے وقت ملا۔ دیگر جس شراب پر مرتے

تھے وہ بھی ہفتوں نہیں ملتی تھی۔

کمالِ غالب سے مرعوبی پر فنکاروں کی سہل انگاری

غالب کی جوانی کی علمی کمائی زیادہ تر فارسی کی کاوش رہی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھوں نے اُردو پر اُس زمانہ میں کچھ لکھا ہی نہیں۔ دس بیس اُردو غزلیں اس دور کی ان کی موجود ہیں لیکن پورا ان کا اردو دیوان اس کا زیادہ حصہ ان کی ابتدائی عمر کا ہے اس میں بھی زیادہ تر وہ غیر الفہم حصہ جو بطرز بیدل تھا۔

طرز بیدل میں ریختہ کہنا   اسد اللہ خاں قیامت ہے

جس کو معلق اور ادق سمجھ کر خود غالب نے آج کے موجودہ دیوان سے نظر انداز طبع کرادیا جس کا ثبوت تذکروں میں موجود ہے۔ نیز اس کی علمی شہادت اس امر سے بھی ملتی ہے کہ یہ امر مسلّم ہے غالب استادانہ حیثیت سے قادر الکلام شاعر تھے۔ اور یہ بھی مسلّم ہے کہ غزل کے اشعار قصیدے کی طرح شیطان کی آنت نہیں ہوتے اور نہ وہ قطعے، رباعی کے انداز کے ہوتے ہیں قدما کے یہاں غزل کے اشعار کم از کم پانچ تھے۔ مطلع حسن مطلع۔ بیت الغزل اور سادہ غزل کا ایک شعر اور مقطع اور زیادہ سے زیادہ سات تھے۔ یہی مطلع۔ حسن مطلع، بیت الغزل، مقطع اور تین سادہ فرد کے جملہ سات متاخرین نے بدرجۂ جواز نو۔ گیارہ۔ پندرہ تک غزل کو وسعت دیدی تھی۔ کم از کم سات اور زیادہ سے زیادہ پندرہ۔ اس کے بعد جب غزل میں اس کی مقبولیت پر دوسرے مضامین سیاسی، صوفیانہ و فانی وغیرہ سموئے گئے تو پھر غزل غزل نہ رہی اور یہ تعداد بھی حد بندی کی حدود سے آزاد ہوگئی

مگر پانچ سے کم غزل کے اشعار کو کسی نے بھی متقدمین میں ہوں کہ متاخرین میں جائز نہ سمجھا چنانچہ اس سے کم تعداد میں ایک بیت۔ فرد کہلاتا ہے۔ دو بیت قطعے، رباعی کہلاتے ہیں اور بھی مثلث، مخمس، مسدس ہیں مگر غزل اپنے شعور پر کم از کم پانچ سات شعر کی ہی ہوتی ہے۔ پھر غالب جیسے قادر الکلام شاعر پر یہ تو نری تہمت ہوگی کہ اس کی وہ ابیات جو درج دیوان ہیں اور غزلیات کہلائی جاتی ہیں تو پھر یہاں وہ پابندی پانچ سات والی کیوں مفقود ہے کہ کہیں ایک ہی بیت ہے کہیں دو کہیں تین اور کہیں چار غزل کہلاتے ہیں جبکہ غزل کہلانے کے قانوناً اصطلاحاً مستحق نہیں ہیں۔ آپ نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالب ان کو مکمل نہ کر سکے اور نہ یہ کہہ سکتے ہو کہ انہیں موقعہ نہ ملا۔ افسوس کہ نقادوں کی نگاہِ عقابی یہاں کیوں مرعوب ہو کر چکاچوند ہو گئی اور ادھر بالکل نہیں اٹھی جہاں اور بھی بہت سے امور اوجھل ہیں جن میں بعض کی نقاب کشائی ہم نے کر دی ہے غرض یہ آپ کی لاکھ عقیدت مندی سہی کہ غالب کے کلام کا جو بھی پُرزہ ملا داخل در دفتر دیوان کر دیا گیا۔ مگر یہ تدمت تو خود غالب فرما گئے ہیں۔ بجز غالب کے یہ سہل انگاری کسی اور شاعر کے ساتھ آپ نے کیوں برتی ہوگی؟ کہ اس کا ایک بیت کہ دو کہ تین غرضیکہ جتنے بھی ہوں غزل کے دیوانچہ میں ضرور رہیں۔ اور اسی عقیدت کے ساتھ الاپے جائیں جو اس کی سہل ممتنع ابیات کو مقام میسر ہے جیسے ملاحظہ ہو۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی	میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی	اب کسی بات پر نہیں آتی۔ وغیرہ

اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ یہ ادھورے ابیات بقیۃ السیف وہی طرز بیدل والے عسیر الفہم برادری کے تھے کچھ غالب نے خود ہی قلم زد کر دیئے تھے اور جو کچھ باقی رہ گئے ان کی تعداد ناقص رہ گئی۔ اور غالب نے اردو کو اپنا سرمایہ بے مایہ ہی سمجھا فارسی کے مقابلہ میں یہ بھی اسی بے التفاتی کا قدرتی اور لازمی نتیجہ ہے آخر عمر میں غالب کو اپنی اس غلطی کا احساس بھی ہوا مگر تب ہاتھوں کے طوطے اڑ چکے تھے۔ اگر غالب میں کچھ بھی سکت رہتی تو ضرور وہ اپنے اس دیوانچہ کو ایک معتدل انداز کا دیوان بنا سکتے تھے۔ فارسی جیسا ہزاروں اشعار پر مشتمل نہ سہی مگر قدرت کو بتانا تھا کہ آدمی جس چیز کو اپنی توہین کا باعث سمجھے وہی اس کی عزت کا نشان ثابت ہو۔ یہی ع

"بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است"

آج غالب کی یادگار رس قائم کرا رہا ہے اسی کو کہتے ہیں عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم" - آج غالب، غالب اسی اپنے بیرنگ بے قدر مجموعہ پر ہیں کہ دوستوں کے اصرار نے جن مغلق اور ادق اشعار کو خارج کرا دیا تھا غالب نے کسی درجہ میں بھی اتنا اہم نہ سمجھا کہ دوسرے سہل الفہم اشعار سے تعداد پوری کر دیتے ان کے دماغ میں تو وہی "فارسی بین" کی بین بج رہی تھی غالب کو اپنی اس غلط فہمی کا تب شعور ہوا جب

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب　　　　اب عناصر میں اعتدال کہاں

کا زمانہ تھا اور غالب نے سمجھ لیا تھا کہ اب یہ فارسی کی بین نہیں بجے گی اردو ہی بجے گی جس کو میں نے بیرنگ سمجھا تھا۔ اور اک حقارت آمیز لہجہ میں اسے مجموعۂ اردو

کہا تھا۔ ہم پھر اہل بصیرت اہل کمال ہستیوں کی نگاہِ التفات اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ وہ اس حقیقت کے حقیقی پس منظر کو سمجھیں اور غالب کا صحیح تعارف قوم کے سامنے پیش کریں اور جن چیزوں کی ہم نشاندھی کرتے آرہے ہیں اس کو بھی بغور ملاحظہ فرمائیں کہ غالب کا اردو ادب پر جو احسان لافانی ہے۔ وہ اردو شاعری سے کہیں زیادہ خطوط نویسی ہے۔ قوم لاشعوری طور پر نثرِ غالب سے ضرور متاثر ہوئی ہے۔ اگرچہ تقلید نہ کر سکی مگر پھول نہ سہی پنکھڑی ہی سہی سہل اردو لکھنا تو غالب کی ہی نوازش کہلائیگا۔ شاعر سب نہیں ہوتے لیکن خط پتر سب ہی لکھتے نہیں تو لکھواتے ضرور ہیں۔ یہ سہل اردو لکھنا اردو ادب کو اردو خطوط غالب نے ہی بخشا ہے رہی ان کی یہ اردو شاعری اگر وقت ملتا تو یہ بھی اک نعمت لافانی ملک و وطن کیلئے بنتی۔

پھر بھی اس نے اردو شاعری کے دھارے جو غلط بہہ رہے تھے ان کی سدھار میں وہ اہم رول ادا کیا ہے کہ ہم سب آج غالب کے بالواسطہ کہ بلاواسطہ شاگرد ہیں کوئی اہلِ سخن آج یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ غالب اسکول سے ہٹ کر دو بول شعر کے بول سکتا ہے یا دو فقرے لکھ سکتا ہے وہ ہماری قدیم اردو شاعری جو مرورِ زمانہ سے ابتذال کے ہاتھوں مر چکی تھی اس کی مسیحائی میں غالب کا بیشتر حصہ ہے اگرچہ غالب نے بارہ سو شعر کا ایک اردو دیوانچہ چھوڑا مگر وہ صالح قدریں اس میں اردو کی اردو شاعری کو دیدی ہیں جن سے اردو شاعری کے خط وخال اور نوک پلک درست ہوئے۔ غالب کی تقلید میں جس انقلابی موڑ پر اردو شاعری پہنچی یہ اپنے حسن ناآشنائے خزاں سے تادیر زندہ و پائندہ رہیگی اور ہم آج غالب کیلئے خراج تحسین ہدیہ پیش کرنے میں حق بجانب خود کو پاتے ہیں۔

غالب کی دشوار پسندی

معاشرہ میں یہ امر انسانی فطرت بن چکا ہے کہ جب اس کو بچپنے میں اجتماعی ماحول میسر نہ ہو۔ یعنی آدم کی فطرت کا یہی تقاضا ہے کہ "خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے"۔ انسان بھی "الصحبت المؤثر" وہ پہلے اپنے اردگرد آس پاس کے ماحول اور اپنے ہم عصر بچپنے کے ساتھیوں سے اثر لیتا ہے اور خالی اپنے دماغ پر زور نہیں ڈالتا۔ اس لئے کہ سہل انگاری اور تساہلِ طبعی اس کی فطرت ثانیہ ہے یہی وجہ ہے کہ امیر امرا نواب بادشاہ اور راجے مہاراجے اپنی اولاد کو عوام کے ساتھ بیٹھے پڑھتے دیکھنا اپنی کسرِ شان سمجھتے تو اس کمی، کچی خامی کی مضرت اور نقصان کا جو اجتماعی تعلیم کے نقدان پر ان کی اولاد کو پہنچنا لازمی تھا یہ تدارک کرتے کہ بامرِ مجبوری چند ہونہار لڑکوں کو اپنی اولاد کا ہم سبق ہم مکتب بنا کر علیحدہ اک خصوصی درسگاہ کا انتظام کر دیتے جس میں ان کی اولاد کی تعلیم فی الجملہ بقدر اعتبار ہو جاتی۔ یہ دو چار ساتھی عام شہری آبادی کے ان کے رفیق اس خصوصی مکتب میں رہتے اور اولاد نری بدھو نہ رہتی۔ انگریزوں کے زمانہ میں تو ایسا ایک خاص کالج ہی تھا جہاں صرف والیانِ ریاست کے بچے تعلیم پاتے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا کچھ ماحول بھی سر سید نے ایسا ہی بنا دیا تھا کہ وہاں بھی یہ احساس بدرجۂ اتم موجود تھا۔ اوّل درجے کے رئیس زادے اکثر وہاں تعلیم پاتے جہاں کچھ غربا طبقہ بھی ان کی اعانت پر شریک طعام و کلام رہتا یہ رئیس صاحبزادے تو ملازمت پر نہ جاتے کسی کو کوئی عہدہ یا آنریری مل گئی تو وہ اور بات تھی لیکن یہ غریب گھرانے کے ان کے ساتھی ان کی اعانت اور ان کے بڑوں کی سفارش پر کسی اچھی آسامی پر لگ جاتے۔ اس کا ایک

فائدہ تو یہ غربا پروری تھی ہی دوسرا فائدہ یہ بھی رہا کہ اس تو ابی ٹھاٹھ نے انگریزوں
سے برابری کا سلوک اور احساس کمتری کا فقدان ہر علیگ کو کم و بیش دیا اگرچہ
اس تصویر کا دوسرا رُخ اقتصادی بدحالی رہی کہ سرسید کی یہ ذہنیت رہی کہ
مسلم دُنیا علی گڈھ آئے اور اس خاص ماحول میں پلے بڑھے پروان چڑھے ظاہر ہے کہ پورے
مسلمان اس سے کیسے مستفید ہوتے محض مرفہ حال طبقہ نے اس پر لبیک کہا اور اس
پیش کش سے کچھ جزوی علی فائدہ اٹھایا مسلمان تو پہلے ہی سے اقلیت میں تھے
اس پر علمائے وقت کا سرکاری نظام اور سرکاری تعلیم سے بائیکاٹ اور ملت کی
ناداری کے سبب دُوسری متبادل صورت کا فقدان۔ یہی نتیجہ لایا کہ دفتروں میں
اور اونچی نیچی آسامیوں پر برادرانِ وطن کا حق و استحقاق عملاً لازمی واجبی سا
ہوگیا۔ اور مسلم اقتصادی بدحالی اسوقت کی اپنے اثرات ابتک بتا رہی ہے۔ غریب
شریف گھرانوں میں یہ مکروہ منظر ناقابل دیدنی ہے نہ پیسہ پاس کہ تجارت کرسکیں
اور نہ زراعت کی اہلیت اور معمولی دوکانداری کرتے ہوئے خاندانی شرم حائل اور
یہ حقیقت ایک المیّہ بنکر آج بھی سوہانِ روح بنی ہوئی ہے۔

ہمارا روئے سخن یہی ہے کہ اجتماعی صلاحیتیں تبھی میسّر آتی ہیں جب تمدّن
اپنی مشترکہ مساعی پر ایک متوازن صورت میں ہو۔ ورنہ بہت سی بدحالیاں ایسی
لاعلاج مہلک خرابیوں کو لئے ہوئے جزوِ تربیت ہو جاتی ہیں جن کی اصلاح انسانی
طاقت، سکت اور بشری تقاضوں کے قبضۂ تصرّف میں نہیں ہے۔

غرضیکہ جب تعلیم کی ملی جلی سہولتیں انسانی بچے کو میسّر نہ ہوں تو وہ یا تو احمق الذین
جاہلِ مطلق رہ جاتا ہے یا پھر بدایوں کا للّہ ہو جاتا ہے دورِ اکبری کا عہدی نہ سہی الا ماشاءاللہ

ایسے ہونہار بچے غالب جیسے نادرات سے ہیں جو اپنی دماغی صناعی اور کاوشوں کے بل بوتے پر اس ہفت خواں سے نکل کر دنیا میں مطلع شہرت کے افق پر چمکتے ہیں اور تعصب سے مبرّا سمجھے جاتے ہیں۔ جن بچوں کو یہ فطری سہولتوں کا میل جول میسر نہیں آتا ان میں کے اکثر نرے کنوئیں کے مینڈک رہتے ہیں اور کچھ اقل قلیل ایسے ہوتے ہیں جو اپنی اصلاح حال وقال اپنے دماغ سے کر لیتے ہیں۔ ان کی دماغی ترکیب مزاجی جن اثرات کی حامل ہوتی ہے اس پر اسوقت کے تمدن کا کوئی اثر نہیں پڑتا چنانچہ غالب کا بچپنا اسی منظر کشی کا حامل ہے۔ غالب کا امیرانہ گھرانہ اور بچپنے میں خاطر خواہ تعلیم کا لاڈ پیار چوچلوں میں جنگجو سپاہیانہ مشاغل پر میسر نہ آنا غالب کے جاہل مطلق ابوجہل ہونے کیلئے واحد ذمہ دار تھا اگر غالب میں خداداد ذہانت اور صلاحیت نہ ہوتی۔ اس حقیقت کی روشنی میں غالب ایک حد تک اپنے بچپنے میں اس سعادت سے محروم رہے کہ اپنے ہم عصر ہم جولیوں میں رہ کر علم حاصل کرتے اور تبادل خیالات سے اپنی دماغی تشکیل کر پاتے۔ اسی پس منظر پر تو میر درویش نے فرمایا تھا کہ "اچھی تربیت ملی تو کمال کو پہنچیگا ورنہ بیا دہن گو ہو جائیگا۔" ہمیں اس سے تو ہرگز انکار نہیں کہ غالب کے زمانہ میں اسلامی مکاتیب نہ تھے اور یا پھر ان میں داخلہ ایک غالب ہی کے لئے نہ تھا۔ پھر غالب کا خاندان بھی ایک مسلّم اور مانا ہوا علمی خاندان تھا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ غالب کی ابتدائی تعلیم محض گھریلو تھی تو وہ بھی کون سے جاہل گھرانے کی تھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ غالب مکتب مدرسہ بھی گئے اور ماں کی گود کی عالمانہ تربیت سے بھی فائز رہے۔ مگر برا ہو اس صغر سنی کی نوابی کا اس معصوم بچپنے ہی میں غالب کا نوابی ٹھاٹھ، عیش وعشرت

کے مچلے، اس پر وہ عیش و عشرت پسند جلیس وانیس جو دورِ مغلیہ کے ٹمٹماتے چراغ تھے اور اپنی بے پناہ عیش کوشیوں سے خود بجھتے جارہے تھے غالب بھی اسی زد میں تھے۔ یہ منظر غالب کی آگرہ زندگی میں دس بارہ برس کی عمر تک رہا۔ غالب کے آبائی خون میں جو سپاہیانہ جوہر صدیوں کے چھپے ہوئے تھے جن کا صداقت مآب، اعتراف خود غالب اپنے اس شعر میں پیش کرتے ہیں سے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری　　　کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

یعنی یہ بسالت، شجاعت کا خون جب اپنے آبائی فنی جوہر میدان سپہ گری میں نہ بتا سکا تو غالب نے اپنی شہسواری کے لئے اشہب قلم کو میدانِ شاعری میں دوڑایا اور ہم جولیوں کے اثرات کو خود پر نہ پڑنے دیا تھا اپنے دماغ پر زور ڈالا اور پتنگ بازی، بلبل، بٹیر بازی، چوسر، گنجفہ، تاش، شطرنج وغیرہ جیسے لہو ولعب کے مشاغل جو اس وقت کی تہذیب کے لازمۂ زندگی تھے ان کے ہوتے ہوئے بھی غالب کی علمی دھن تھی۔ اس پر چار چاند ملا عبد الصمد کی حقیقی کہ فرضی اتالیقی نے لگائے ہوں یا بہ ثبوتِ روایات نظیر اکبر آبادی، اور مولوی محمد معظم کی مکتبی کرامت کی برکتیں ہوں حالات کی روشنی میں یہی پتہ چلتا ہے کہ ان مکتبوں میں بھی خالی ابجد کی ہی تعلیم نہ تھی بلکہ شعر و شاعری کا اعلیٰ مذاق بھی زیر تربیت تھا جس پر غالب اثر انداز تھے متاثر نہ تھے اور ایسا ہوتا ہی ہے کہ ایک ذہین لڑکا اپنے طبعی رجحان کی طرف پوری خانقاہ کو مائل کرلیتا ہے جب کہ اس کی ممد و معاون خانگی خوش حالی بھی ہو۔ غرضیکہ غالب اپنی اس صغر سنی میں پورے تعیش کیساتھ اپنی دماغی بہادری کو میدانِ دغا نہ ہونے پر میدانِ شاعری میں صرف کر رہا تھا۔ چونکہ غالب

کے بچپنے کے علمی تمدن پر فارسیت اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ فارسی میں گفتگو اور خط وکتابت غدر ۱۸۵۷ء تک رہی اور طبیبوں کی نسخہ نویسی تو آج تک ہے۔ ملک کی تصنیفی زبان فارسی تھی۔ شعروشاعری کے میدانِ مسابقت فارسی میں گرم ہوتے تھے۔ سونے پر سہاگہ غالب کہ جس کا خود دادا سمرقند توران سے ہندستان آیا تھا اس کی رگوں میں ایرانی تورانی خون گرم تھا جس کے یہ لازمی نتائج ہوئے کہ ہر قسم کے دستوری تقاضوں سے پہلے غالب نے فارسی شعرا کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا۔ خود ایک شوخ طرحدار مزاج کے مالک تھے۔ بچپنا امیرانہ ٹھاٹھ میں گذر رہا تھا۔ اس معصوم دماغ پر وہ سب نقوش فارسی شاعری کے "کالنقش فی الحجر" عکاس ہوئے جو اس فارسی شاعری کے آخری دور میں فارسی شعروشعور کے خصوصیات تھے۔ غالب نے ان چیزوں کو اپنی طبیعت ثانیہ بنالیا تھا۔ اس پر ملا عبدالصمد کی سرراہے کی ملاقات ہی تھی۔ جس کو غالب نے اپنی خاندانی علم دوستی پر دو سالہ مہمانداری کی صورت میں اپنایا کہ اس عالم کی صحبت سے غالب کے آئینۂ دماغ پر وہ سب محاورے فارسی کے مرتسم ہو گئے۔ جو دہاں مروج تھے اور غالب میں ایک انفرادیت کا جذبہ جو فطرتاً ودیعت تھا۔ اس نے نامعلوم طریقہ پر انانیت کا وہ کوس انا ولاغیری بجایا کہ یہ بے چارہ عبدالصمد تو آیا گیا ہوکر رہ گیا یہاں تک کہ خود غالب نے کسی ترنگ میں اس نسبت کا ہی انکار کر دیا کہ "میں کسی صمد غیر صمد کا شاگرد نہیں ہوں مجھے بالذات تلمذ ذاتِ حق سے ہے" ورنہ خود تاریخی ثبوت اس عبدالصمد کے رہنے کا غالب کے یہاں موجود ہے خود عبدالصمد یہاں سے چلے جانے کے بعد کسی خط میں غالب کے متعلق غالب کو لکھتا ہے "اے عزیز چہ کسی، کہ باایں ہمہ آزادیہا، گاہ گاہ بخاطر

می گذری، یہی ایک جملہ غالب کی سیرت، افتادِ طبع اور اس کے بچپن کے طریقۂ زندگی کو آشکارا کرنے کے لئے کافی ہے جس سے میر علیہ الرحمہ کے قول کی بھی تصدیق مزید ہوتی ہے کہ - یہ بچہ تربیت پر کچھ سے کچھ ور نہ یادہ گو بنجائے گا جس حقیقت کے پس منظر پر میر نے کہا تھا وہ پیشین گوئی حیاتِ غالب میں بہمہ وجوہ تا زندگی موجود رہی۔ میر نے کچھ خاص انوکھے اثرات غالب میں وہ محسوس کئے جن کی یاد اس نادرۂ روزگار ہستی کو ہندوستان سے چلے جانے کے بعد بھی زمانۂ دراز تک "بہ خیال می گذرد" سے آتی رہی الحاصل! غالب کی ابتدائی زندگی پر بہ نظر غائر مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے غالب کو خداداد ذہانت، فطری خلاقی دی تھی اور انوکھا دماغ وہ قدرت نے فطرتاً بخشا تھا کہ اس نے خدا معلوم خدا ہی کے سامنے کیسے سر جھکایا۔ یہ ہر کس و ناکس کے سامنے سر عجز خم کرنے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ پس غالب اپنے دماغ سے استادی کا کام لیتے اور خود کو شاگردِ قدرت، تلمیذِ فطرت سمجھتے ظاہر امر ہے کہ بدیں حالات غالب کے کلام میں نرمی، خوش گوار تہذیب، کاٹ چھانٹ، اتار چڑھاؤ اور رد و بدل دوسروں کی دیکھا دیکھی مناسب اعتدال مزاج کہاں سے آتا۔ یہ سب چیزیں مل ملا کر اس کی "دشوار پسندی" کیلئے رنگِ میل اور بنیادی وجوہ کا کام دیتی رہیں - یہ غالب کے آگرہ کا وہ بچپنا تھا جس نے غالب کو ایک اکھڑ الھڑ انانیت کا دیوتا بنا دیا تھا۔ یہ چیز غالب کی ملک و قوم کے لئے کارآمد نہ ہو سکی۔ غالب لاکھ ذہین فطری صلاحیتوں والا سہی غالب کو غالب بنانے والی زندگی اس کی "دہلی کی زندگی" ہے جس میں اس کی کم سنی کی شادی کو بہت بڑا دخل ہے۔ غالب کی سسرال ایک نوابی گھرانا اور

عرفان و تصوف کی خانقاہ، گنگا جمنی میل تھا۔

یعنی غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف، نواب احمد بخش خاں والیِ لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے۔ نوابی کے ساتھ ایک صاحب نسبت سلسلے کے مالک تھے۔ اُن کی چھوٹی بیٹی امراؤ بیگم کے ساتھ ۱۳ برس کی عمر میں غالب کی شادی ہوئی اور امیرانہ سسرال کے سبب خانہ دامادی کی قیدِ زنجیر پاؤں میں پڑی۔ آگرہ کا توطن ترک کرنا پڑا دہلی میں آ رہے۔ اگرچہ اس قرابت سے پیشتر بھی غالب کی آمد و رفت دہلی میں تھی۔ لیکن اس نئے تعلق ازدواجی سے غالب کو مستقل سکونت دہلی میں اختیار کرنا پڑی۔ نواب معروف خود شاعر تھے۔ شاعروں کی اور اپنے حلقۂ ارادت صوفی منش طبقے کی غور و پرداخت امداد آپ سے وابستہ تھی غالب کو بھی فرزندی میں لینے کے بعد خسر نے شجر ہائے طریقت کے نقل کی خدمت سپرد کی تاکہ غالب پر سے یہ رنگِ تعیش اتر کر رنگ معرفت چڑھ جائے لیکن غالب کی "عیش کوشی" یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے جس کا پس منظر "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" تھا۔ چنانچہ غالب نے خسر کی فہمائش کہو کہ فرمائش کو گلو خلاصی کیلئے غلط سلط شجرے اتار کر اس طرح پورا کیا کہ پھر نواب صاحب کو جرأت نہ ہوئی کہ داماد صاحب سے اس قسم کی کوئی اور خدمت لیں۔ غرضیکہ غالب بحالِ خود مست رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی خسر کے گھرانے کی معنوی برکات سے بھی مستفید ہوتے رہے اور اپنی شراب نوشی اور عیش کوشی بھی بحال رہی۔ غالب کے کلام میں رنگِ معرفت کی جھلکیاں خسر صاحب کا ہی تصدق ہے۔ بہرحال اب غالب وہ شترِ بے مہار صاحبزادے نہ تھے جو آگرہ میں پتنگ بازی کرتے اور مثنویاں

بھی لکھتے۔ گو عمر کم تھی لیکن یہ نواب صاحب کے داماد مرزا نوشہ تھے۔ بڑے بڑے اہلِ علم اہلِ فن استادوں کا آنا جانا عقیدت مندانہ طریقہ پر خسر کے یہاں رہتا جس کے سبب مرزا غالب کو چار و ناچار سلیقہ شعار سُلجھے ہوئے لباس میں خود کو پیش کرنا پڑتا تھا۔ دہلی اگرچہ اپنے آخری دور میں سسک رہی تھی اس کا ادب و تمدن آخری ہچکی لے رہا تھا۔ انگریزوں کا بالواسطہ تسلط تھا۔ تاہم قلعۂ معلیٰ کی چہار دیواری کے محدود عالم میں سلطان سراج الدین ظفر کو مسلمان ہی نہیں بلکہ پوری ہندستانی دنیا اپنا حقیقی شہنشاہ و شاہِ عالم سمجھتی تھی اور بادشاہ کی دل و جان سے عزت ہر کہ و مہ کے دل میں جاگزیں تھی۔ اور انگریزوں کے ناجائز اقتدار کو مسلمان، طاغوتی اقتدار غلبۂ کفر کہتے اور ہندو برادرانِ وطن اس پردیسی تسلط کو ایک لعنت سمجھتے تھے۔

قلعۂ معلیٰ میں اردو کی گرم بازاری تھی۔ شاہ نصیر کے بعد ذوق استادِ شاہ ملک الشعرا تھے۔ حکیم مومن خاں جیسی مایۂ ناز ہستی کی شہرت، شہرۂ آفاق تھی۔ قلعہ کے اردو مشاعرے بڑی دھوم سے منائے جاتے تھے اور اکثر اردو زبان کے ہی مشاعرے قلعے میں ہوتے۔ شہر میں زیادہ تر فارسی مشاعرے ہوئے جن میں غالب کا حصہ غالب رہتا۔ وجہ یہ تھی کہ افتادِ وقت کہئے یا اتفاق سمجھئے غالب کے چچا انگریزی حکمرانوں کے نوکر تھے۔ غالب کی خاندانی پینشن انگریزوں سے ملتی تھی "جس کا کھانا اسی کا گانا" غالب انگریزوں کو اپنا مربی، بہی خواہ سمجھتے تھے۔ علی الرغم دیگر ساکنانِ دہلی کے۔ اس وجہ سے غالب کو قلعۂ معلیٰ سے یا خدا واسطے کی دشمنی تھی یا وہاں تک رسائی نہ تھی۔

بہر حال اجنبیت اور بیگانگی ضرور تھی۔ فقیر اپنی کھال میں مست۔ امیر اپنے مال میں یہ ملا عبدالصمد کی تربیت کے جوہر دہلی شہر میں اپنی فارسی دانی کی تعداد صلاحیت پر سلیقہ سے پیش کر رہے تھے۔ اس وقت کافی شعور فارسی کا عوام میں تھا۔ مناسب فارسی ادبی ذوق اور علمی سودا۔ ان حضرات میں موجود تھا اور یہ غالب کا دل و جان سے باوجود کم سنی کے احترام کرتے تھے۔ اس سے پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ غالب کی باقاعدہ تعلیم نہ تھی محض اس نے اپنی ذہانت سے ایک ایرانی مجتہد شیعہ کی صحبت میں صرف دو سال کے قلیل عرصہ میں وہ بھی بعالم صغر سنی وہ سب کچھ معلومات اپنے غیر معمولی حافظے کی بدولت اپنے دماغ میں خزانہ کر لئے تھے جن کا من وعن استظہار کہنہ مشق اہل علم سے بھی شاید باید تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سب غیر مرتب معلومات جو غالب کے دماغ میں محفوظ تھے غالب کی زبان و قلم سے ساختہ و بے ساختہ اظہار بیان چاہتے تھے بلکہ استظہار خروج جس کا لازمی نتیجہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا۔ غالب لاکھ کوشش کرتے حسب گفتہ ؎ خود گویم مشکل نہ گویم مشکل۔ ان کی حالت تھی یہی سب سے بڑی بنیادی وجہ ہے کہ غالب "دشوار پسند" کہلائے اور لوگوں کے طعنے تشنے سہے سنے، چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مولوی عبدالقادر رامپوری جو نہایت ظریف الطبع تھے انہوں نے غالب کے سامنے یہ شعر پڑھا ؎

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال

پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

اور کہا کہ آپ کے اس شعر کے معنی سمجھ میں نہیں آئے غالب سُن کر حیران ہوئے۔

بولے کہ حاشا یہ میرا یہ شعر نہیں ۔ مولوی صاحب نے مزاحاً کہا کہ "واہ میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں" بالآخر مرزا صاحب کو معلوم ہو گیا کہ میرا خاکہ اڑایا جار ہا ہے بس اسوقت لوگ ایسی غزلیں مشاعروں میں لکھ لاتے ۔ جن کی بندش الفاظ چست ۔ مطلب کوہ کندن و کاہ بر آوردن بھی نہ ہوتا مقصود اس سے غالب کی تضحیک محض ہوتی کہ آپ کی شاعری یہ ہے ان حقائق کی روشنی میں صاف معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو مروجہ دستوری تعلیم میسر نہیں آئی تھی ۔ وہ محض اپنی خداداد ذہانت سے زمین کے قلابے آسمان سے ملاتے اور اپنی تضحیک کا سامان خود اپنے ہاتھوں پیدا کرتے ۔

الحاصل ! اسی سقم طبعی سے غالب اپنی افتاد طبع پر میدان شعر میں فارسی شاعری کرتے رہے جس میں ادق خیالات عرفی ، خاقانی وغیرہ کی تقلید میں ادا ہوتے اور غالب کی خود اپنی تسکین طبع ہو جاتی ۔ یہ فارسی کلام غالب کی نظم و نثر کا اسقدر ادبی و شوار گذار گھاٹیوں سے گذرتا ہے کہ اگر زمانہ تک صرف ایم اے کورس میں رہا ۔ اور اب وہاں سے بھی وظیفہ یاب ہو کر محض ریسرچ کے حلقۂ تحقیق میں جذب و انجذاب کی ممنونیت میں ہے ۔

اگر غالب کا تعلق اس زمانہ میں قلعۂ معلیٰ سے ہو جاتا تو ممکن تھا کہ وہ اُردو شاعری میں اپنا اشہب قلم دوڑاتے اور زبان بادشاہ کی مزاج کی ہمنوائی میں بہت کچھ آسان ہو جاتی ۔ غرضیکہ غالب کی دشوار پسندی کے سلسلے میں غالب کے ماحول کو بے حد دخل ہے جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے :-

۱۔ غالب کا رواجی رسمی تعلیم سے نابلد رہنا۔

۲۔ ضرورت سے زیادہ ذہن اور فکر رسا پانا۔

۳۔ غضب کی قوتِ حافظہ کہ عمر بھر کتاب نہ خریدی۔ کرایہ پر لی پڑھی واپس کردی اور دماغ ایک کتب خانہ بن کر رہ گیا۔ جو حسب اقتضائے طبع چاہتا تھا کہ سب اپنے خزانے ایک ہی وقت میں اگل دے۔

۴۔ غالب کا اپنے خاندانی اثرات کے تحت انگریزوں کا فرماں بردار، بہی خواہ ان کے رحم و کرم کا پروردہ اور ان کا پنشن خوار ہونا جس کا لازمی نتیجہ قلعۂ معلیٰ سے بے خبری، بے تعلقی اور قلعۂ معلیٰ کا ظفر موج حلقۂ شعر و سخن شاہ ظفر کی قیادت میں ظفر کی طرح آسان اردو میں شعر کہنے پر تلا ہوا تھا۔

جب ذوق کے بعد غالب کی رسائی قلعہ میں مستقل ہوئی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جب سیاسی مصلحت اور پولیٹکل حالات کے تحت انگریزوں نے حکیم احسن اللہ خاں کو جو اُن کا بہی خواہ، معتمد اور بھروسہ کا آدمی تھا۔ شاہ پر دباؤ ڈال کر بادشاہ کا مدار المہام بنوایا کہ قلعہ کے اندرونی حالات سے کماحقہٗ واقفیت رہے۔ حکیم صاحب کو غالب سے بے حد اُنس و عقیدت تھی۔ انہوں نے چاہا کہ غالب جیسا لائق شاعر اور دربار سے علیحدہ رہے؟ ادھر بادشاہ کو بھی اصلاحِ سخن کے لئے استاد کی ضرورت تھی۔ غالب بحیثیت ایک مورّخ کے پہلے قلعہ میں داخل ہوئے۔ تاریخ نویسی جو ان کا طبعی مشغلہ نہ تھا۔ خدمت ملی حکیم صاحب تاریخی مواد جمع کرکے غالب کو دیتے۔ غالب اپنی مخصوص فارسی میں اسکو ڈھالتے۔ لیکن قلعے کے مشاعروں کی شرکت نے غیر ارادی طور پر غالب کو مجبور کر دیا کہ وہ اردو میں غزل

رکھیں اور آسان اُردو میں۔ اگرچہ مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ جیسے حلقۂ ارادت والے احباب کے تقاضوں کو اس میں بے حد دخل تھا لیکن عملی صورت میں غالب نے اس دشوار پسندی سے اُسی وقت توبہ کی جب بادشاہ کی خواہش آسان اردو اشعار میں دیکھی۔ اگر غدر کے سبب یہ مجالس و رہم براہم نہ ہوتیں تو غالب کی خداداد حذاقت اور ذہانت سے جس سحر نگاری کا ثبوت اس کے اردو خطوط میں ملتا ہے ہم یقینی طور پر بجا توقع کرسکتے تھے کہ غالب اُردو کے اچھے سلجھے ہوئے اشعار کا کافی تعداد میں ذخیرہ چھوڑ جاتے اور ہم صرف دو تین غزلیں ہی اس ثبوت میں نہ پیش کرتے بلکہ اس دیوان زادے کے بکثرت اشعار آسان اردو میں غالب کے نامۂ اعمال میں پیش کیے جا سکتے تھے اور خود یہ دیوان زادہ آخر یہ دیوانچہ ہی کیوں رہتا یہ بھی اک تنومند فربہ دیوان ہوتا۔

غدر کے بعد غالب کا رجحان طبع اُردو خطوط کی اشاعت کی طرف رہا آپ کے سامنے جو غالب کا اردو دیوان ہے اس کی طباعت غدر سے پیشتر کی ہے اور غالب کو اپنی شہرت کا احساس اپنے خطوط کے ذریعہ حدِ یقین کو پہنچ چکا تھا وہ مرتے دم تک اسی اُدھیڑ بُن میں رہے حتیٰ کہ ان کے کچھ ماہ بعد ان کی یہ آرزو پوری ہوئی جس سے ان کی رُوح کو ابدی، ادبی اطمینان ہوا۔ تاہم یہ چھپے تو وہ چھپے۔

قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ انسان جس چیز کو کمتر سمجھتا ہے وہی اس کی ترقی اور فلاح و بہبودی کا ذریعہ بنتی ہے چنانچہ غالب کو اپنی آخری عمر میں یہ معلوم

ہو گیا تھا کہ میرا یہ عقیدہ "فارسی بین گر بہ بینی" غلط بنیادوں پر قائم تھا۔ آج غالب
علیٰ کل غالب اسی اردو دیوانچہ کی بدولت ہیں۔ جس پر چار چاند یا سونے پر سہاگہ
ان کی اردو نثر نگاری ہے۔

فی الحقیقت غالب کا اُردو ادب پر احسانِ عظیم ان کے اردو خطوط ہیں اور
اُردو شاعری ان کے طفیل میں نیک نام اور ثمر اندوز ہے۔ غالب اسی اردو نثر نگاری
پر صاحب طرز ہیں نہ کہ اردو شاعری پر۔ تاہم غالب کی اردو شاعری نے پچھلے مذاق
سے ہٹ کر جو کیفیاتِ حسن اُردو کو بخشتے ہیں جس سے اُردو شاعری کو بقائے دوام
میسّر آیا یہ بھی غالب کا کارنامہ اردو ادب کے حق میں کچھ کم نہیں ہے یہ اور بات
ہے کہ قوم غالب کو اسی تعلق سے دیکھنے کی خوگر ہے اور اسی نسبت سے اس کی
مداح ہے کہ لوگوں کا عام مذاق شعری ہے اور واقعی نثر کا کمال اک سہل ممتنع چیز ہے

غالب کا فکرِ سخن

یہ مسلّم ہے کہ جیسے غالب اپنے وقت کے صاحب طرز
ہیں نثری کلام میں ایسے ہی شعری زمین میں بھی
اگلوں سے بالکل منفرد ہیں۔ گل و بلبل کی شاعری کی مردہ تشبیہیں کچھ اس قدر
مبتذل اور عام ہو چکی تھیں کہ ان کو سنتے سنتے بالکل طبیعتیں سیر، بلکہ اکتا چکی تھیں،
غالب نے اپنی زمینِ شاعری پر وہ ملکوتی شاعرانہ خیالات سے گل کاری کی کہ شاعری
کے مردہ جسم میں لطیف روحانی خیالات کی رُوح پھونک دی جس میں نادیدہ روزگار
کیفیاتِ انسانی کی جھلکیاں اس قدر واضح طور پر نمایاں ہیں کہ :۔ غالب

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غالب کے کلام میں ہر جگہ آشکارا ہے۔ میر حسن دہلوی کی طرح اطالوی

شاعر ارسطو نے اپنے دیوان میں عجیب گل کاری اور آئینہ بندی سے منور اور پُر عشرت محلات تیار کئے۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ اے غریب کاشانہ نشین شاعرانہ یہ ساز و سامان کہاں سے لایا۔ ارسطو نے جواب دیا کہ الفاظ خشت و سنگ سے ارزاں ہیں لیکن مرزا غالب کے الفاظ لعل و گہر سے گراں تر ہیں۔ مرزا غالب اس بات سے خوب واقف ہیں کہ مترادفات کو محض مؤلفانِ لغت نے طلباء کی سہولت کی غرض سے وضع کر لیا ہے ورنہ ایک معنٰی کے دو لفظ کسی زبان میں نہیں ہیں۔ "توام" بچے کتنے ہی ہم صورت ہوں ان کو ایک دوسرے کی عارضی غیر حاضری میں بھی ایک سمجھنا فاش غلطی ہے۔ مرزا الفاظ کے نازک سے نازک فرق کو بھی خوب جانتے ہیں۔ مرزا نے ایک لفظ کو جہاں تک ہو سکا ہے دوبارہ استعمال نہیں کیا ہے۔

اس کی وجہ سحبانِ وائل کی طرح یہ نہیں ہے کہ وہ کسی لفظ کی تکرار نہیں کرتے بلکہ یہ ہے کہ وہ کسی خیال کا اعادہ نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا نے اپنی شاعری میں محاوروں کی بندش سے احتراز کیا ہے۔ تمام دیوان میں بمشکل دس شعر ایسے ہوں گے جن میں کوئی محاورہ بندھا ہو۔ اس لئے مرزا اس نکتے سے غافل نہ تھے کہ عمدہ سے عمدہ محاورہ بہ لحاظِ عمر ضعیف ہو کر بے جان ہو جاتا ہے اور ادھر شعرستانِ اردو کی یہ غفلت شعاری ہے کہ آگرہ اسکول، دہلی اسکول لکھنؤ اسکول اور پھر بعد کا حیدر آباد بھی ملا لیں۔ ان کے ادبی مراکز انھیں محاوروں کی رسہ کشی میں دست و گریباں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی ہر نئی غزل کا بے چینی سے انتظار لکھنؤ کے اربابِ شعور کو رہتا تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ الفاظ سازی کے فن میں مرزا مجتہد کامل کا درجہ رکھتے

رین وضع اصطلاحات میں وحید الدین سلیم پر بھی یہی اثر غالب، غالب ہے۔ کلامِ غالب کی نوادر تراکیب اضافی اس چیز کا کھلا ثبوت ہیں چند ے ملاحظہ ہوں۔
تمہیدِ شکایت۔ اعتمادِ دل۔ جراءتِ آزما۔ نقشِ فریادی۔ مکتبِ غمِ دل۔ سخت جانی ہائے تنہائی۔ ہمتِ دشوار پسند وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے باب میں بعنوان "کلامِ غالب کی قبولیت کی وجوہات" یہ چیز اور واضح شکل میں پیش کی گئی ہے۔ غالب کی شاعری موسیقی کی سرحد سے عبور کر کے مصوری کی حدود تک پہنچ چکی تھی جس کے لئے "علم الاصوات اور علم الالوان کا جاننا لازماً ضروری ہے" غالب رسمی عروض کی پابندی پر الفاظ کے ایسے نگینے بٹھاتے ہیں کہ جن کے جواہر معانی وہ کیفیات کی تصویر کشی کرتے ہیں جس سے غالب کا شستہ پن اور اس کا کمالِ تصرف، اس کی تشبیہات اور استعارات میں ظاہر ہو رہا ہے۔ مرزا کی خود آفریدہ تشبیہات اور استعارات اس بے تکلفانہ انداز سے مستعمل ہوئے ہیں کہ وہ اپنی فطری سلاستِ طبعی سے ایسے نظر آتے ہیں۔ گویا وہ ہمیشہ سے ہماری زبان میں موجود تھے۔ اور ہزار بار کے گھستے ہوئے ہیں۔ مرزا کے یہاں اس قسم کی تازگی ہے جو مکمل بہارِ زندگی کا ثبوت دیتی ہے۔ کلام صنائع بدائع کی ظاہری آرائش میں پھیکا نہیں ہوتا۔
شاعری کے لئے صرف زبان پر قدرت ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ فطرت کا بڑا نکتہ داں بھی ہونا ضروری ہے جس میں غالب بہ حدِ کمال امام مانے گئے ہیں اور زندگی کی روزمرّہ تصویر کشی میں غالب پورے کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔
غالب اگر کہیں روزمرّہ تصاویر کا دوسرا رُخ بھی پیش کرتا ہے تو اتنی کھلے پن

اور ندرت کے ساتھ یعنی ایسے واقعات جو حقیقت اور قدرت کے مطابق تو ہیں لیکن امید اور عادت کے خلاف ہیں تو دوسرے شعراء کے یہاں وہ اپنلئے نہ جا سکے غالب نے انھیں بھی باندھا ہے۔ مثلاً

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لیکے رہ گئے ۔۔۔۔ صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

وہ صنم جو عشق کو جنون کہتا تھا حسن کے اثر کا منکر تھا سب پر پھبتیاں کستا تھا اور مذاق اڑاتا تھا۔ اب خود اپنے جمال کے ایک ہی جلوے سے کیسا مبہوت اور حیران ہے یعنی خود اپنی لاجواب صورت آئینہ میں دیکھ کر خود فطری طور پر فریفتہ ہو جانا گو از طبعی نہ ہو خلاف عادت ہے لیکن از حقیقت ضرور ہے یہ کیفیت دوسروں کے یہاں مستور ہے اور غالب کا فکر رسا وہاں کی منظر کشی کر رہا ہے۔ غالب کے کلام کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی جرارت اور استعداد یا خداداد ذہانت یا اور کسی نامعلوم کیفیت کے اثر سے خود کو معشوق سے اتنا قریب بتاتے ہیں کہ دوسرے اس مقام کی کیفیت کی نقالی بھی نہیں کر سکتے کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے ۔۔۔۔ جلّاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

"ہاں اور" میں جو کیفیت غالب نے پیدا کی یہ وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جن کو ملکہ سخنوری عطیۂ قدرت ہے جو محض جرارت قلم سے نہیں ٹپکتا۔ اور ایک شعر ملاحظہ ہو

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایکدن ۔۔۔۔ ورنہ ہم چھیڑینگے رکھ کر عذر مستی ایکدن

شعر اپنی زبانِ اشارے سے بول رہا ہے اور شاعر کے مقام کو اتنا اوپر بتاتا ہے کہ یہ کیفیت دوسرے شاعروں کے یہاں جھجک کے سبب ظاہر نہیں ہوتی۔ اگرچہ "کھل جاؤ"

اور "چھیڑیں گے" میں ابتذال ہے اور کچھ سوقیت کا بھی واہمہ ضرور ہے۔ مگر منظر کشی کس غضب کی ہے کہ آج شراب کی بدمستی میں بے تکلف ہو جاؤ کہ یہ خمار بدمستی اس کے لئے عذر ہو سکتا ہے ورنہ پھر ہم اپنے عذر مستی پر دست درازی کسی دن کر بیٹھیں گے۔ اور معذور سمجھے جائیں گے کسی کی مستی اور کسی کی بدمستی کا تقابل کیا کہنے۔

غرضیکہ یہی پختگی ادائے کیفیات کی جو غالب کے ہر شعر میں پنہاں ہے دوسروں کے یہاں پچاس برس بعد کچھ آئی بھی تو نقالی سے آگے نہ بڑھ سکی اصلیت کا کیف میسر نہ آیا۔ جس طرح غالب کی خطوط نویسی کی لوگوں نے طرز اڑائی اور دو چار روڈ گ (لمبے قدم) بھر کے گھٹنے ٹیک دیئے ٹھوکریں کھائیں اور آجتک اس تقلید، نقالی میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔

لطف مشام جان غالب کے ہی خطوط ہیں۔ یہی حال ان کی شاعری کا ہے کہ لوگوں سے ان کیفیات کی صحیح معنوں میں نقالی بھی نہیں ہو سکی۔ آخر کار ماننا پڑتا ہے کہ "شاعری جزویست از پیغمبری" کا اعجاز خداوند قادر نے غالب کو کافی حد تک بخشا تھا۔

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

یہ مضمون دوسروں کے یہاں برسوں کی کہنہ مشقی کے باوجود نہ بندھا۔
الغرض بقول ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری "مرزا غالب کے کلام کی عجیب سادگی اور ہوشیاری اور عجیب تر بے خودی اور پرکاری انتہائے کمال ہے"۔ یہ وہی حقیقت ہے کہ غالب اور ٹیگور کے کلام کی سادگی سے لوگ مغالطے میں پڑ جاتے ہیں اور وہ

سہل ممتنعات جوان پختہ کاران قادر الکلام ہستیوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں دوسرے سمجھتے ہیں کہ ان کی نقالی، محاکاتی کوئی بڑا کام نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ "ایں کارے دارد" یہ ملکہ صرف ایک وہبی عطیۂ ایزدی ہے۔ سبھی اصول موسیقی کے پڑھ کر "تان سین" نہیں بنجاتے اور ایسے ہی نہ خوشنویس کاتب اور نہ خوش الحان قاری۔

ہم کلام غالب کا جب مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ہر قسم کی سنگلاخ زمینوں میں بھی غالب کے اپنے قلم کی جولانی نظر آتی ہے چنانچہ یہ اشعار اس کے لئے کافی ہیں

دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا　　کہتے ہیں نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرم دہقاں ہے

طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں　　آ کہ میری جان کو قرار نہیں

چونکہ مرزا اپنے فلسفیانہ خیالات کے لئے موزوں الفاظ کی تلاش میں اُردو کے ذخیرۂ الفاظ کو محدود پاکر اپنی جدتِ طبع سے فارسی تراکیب اضافی کے اختراع میں اجتہادِ کامل کا درجہ رکھتے ہیں اس لئے لوگوں کا گمان ان کی مشکل پسندی کی طرف اس قدر بدگمانی لئے ہوئے ہے کہ بعض کج فہم دریدہ دہنوں نے ان کو مہمل گو تک کہہ ڈالا۔ حالانکہ غالب اپنے وقت کے رُوح العصر تھے بقول غالب ؎

رُوح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں　　پاتا ہوں داد اس سے کچھ اپنے کلام کی

یعنی اگرچہ جبریل ؑ بھی اس کے ہم پلہ نہیں دوسروں کا تو کہنا ہی کیا مگر پھر بھی کچھ اپنے شعروں کی داد بقدر اشک شوئی رُوح الامین سے مل جاتی ہے۔

بس وہ کچھ سمجھ لیتے ہیں پوری فہمائش وہاں بھی نہیں ہے۔ اور سنیئے ؎
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں　　غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

گویا روح القدس ہر زمانہ میں ضرورتِ انسانی کے لحاظ سے جذبات و خیالات کی تعلیم ذکی الحس افرادِ انسانی کو دیتے رہتے ہیں میرا شمار بھی اسی زمرہ میں ہے میرے دماغ میں یہ مضامین غیب سے یعنی الہام سے آتے ہیں۔ اور میرے قلم کی چرچراہٹ غیبی فرشتے کی آواز ہے غالب اپنے وقت کے روح العصر تھے جنہوں نے کیفیاتِ حسن کی وہ ہو بہو محاکاتی کی کہ اردو شاعری کی مردہ روح نے نئے غالب کی زندۂ جاوید مسیحائی میں جنم لیا جس کی جھلکیاں دوسرے دور میں اقبال کے کلام پر پڑتی نظر آتی ہیں۔

یعنی رومانی شاعری کے مطمحِ نظر کو غالب نے یکسر بدل دیا۔ پورے دیوان میں جرات کے انداز کا ایک آدھ شعر ہی آپ کو مل سکے گا۔ کلام ہزار آتش آفرینیوں کے باوجود آتش بیانی سے مبرا ہے۔ پورے دیوان میں ایک دو شعر زلفوں کی حد تک گئے ہیں ورنہ اردو شاعری میر حسن کی مثنوی سحر البیان کی تفسیر اور تصویر بھی غالب نے "تاریخ حسن" کو ان بہترین شعوری، غیر شعوری، نیم شعوری کیفیات میں ادا کیا ہے کہ اس زمین پر پھر اردو شاعری کی از سرِ نو وہ بنیاد قائم ہوئی جس کے لئے صحرائے ابد بھی ناکافی ہے اور اسی ایجادِ فکر کا یہ نتیجہ ہے کہ اکبر، حالی آپ کے بعد انقلابی شاعر مانے گئے اور پھر غالب - اکبر۔ حالی کا مجموعۂ امتزاج اقبال کی شکل میں اردو شاعری کیلئے عطیۂ قدرت سمجھا گیا۔ غرضیکہ غالب کی مشکل پسندی خاص اثرات کے تحت تھی ورنہ جس قلم سے ایسے سہل ممتنع شعر نکلیں اس کو مشکل

پسند کہنا خود ایک مشکل ہے اور اک خود فریبی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
نہ سنو گر برا کہے کوئی — نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند — کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیا کسی کا گلہ کرے کوئی

اور ملاحظہ ہو:-

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

غرضیکہ وارداتِ قلبِ انسانی کی وہ کونسی کیفیت ہے جو اس دیوانچہ میں نہیں؟ غالب کا ایک ایک شعر اپنے اندر وہ دنیائے شعر کی محاکاتی کیفیات کا عالم رکھتا ہے کہ دوسرے اساتذہ اس کے مقابلے میں اپنا پورا دیوان بھی پیش کریں تو عہدہ برآ نہ ہو سکیں۔

شبلی مرحوم کا بیان ہے کہ ایک بڑا فرق عام مصوری اور شاعرانہ مصوری میں یہ ہے کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اس کا ایک ایک خط و خال دکھایا جائے لیکن شاعر اکثر محض ان چیزوں کو لیتا ہے اور انہیں کو نمایاں کرتا ہے جن سے ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے باقی

چیزوں کو وہ نظر انداز کر جاتا ہے یا ان کو دھندلا رکھتا ہے کہ اثر اندازی میں ان سے خلل نہ آئے غالب کہتا ہے ؎

جبتک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

یوں تو معشوق کے قد کو قیامت سے تشبیہ اوروں نے بھی دی ہے لیکن غالب نے جس انداز سے اس کی تشریح کی وہ یہ ثابت کرتی ہے کہ قدِ یار فتنۂ محشر ہی نہیں بلکہ فتنۂ محشر اس کے سامنے ہیچ ہے ہم اس کو ایک خیالی واہمہ تصوّر کرتے تھے یار کے قد نے جب اپنا سراپا پیش کیا تو ہم سمجھے کہ محشر بھی کوئی راستہ کی چیز ہے۔ علم بیان میں امر تشبیہ کے بارے میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ جو وصفِ مشبہ، مشبہ بہ میں زیادہ ہے مشبہ میں تشبیہ سے پیدا کیا جائے یعنی گلاب کے پھول سے رخسارے معشوق کے گالوں کو گلاب کے پھول سے تشبیہ اس لئے اگر آپ یوں کہنے لگیں کہ گلاب کے پھول معشوق کے رخسار کی جیسے ہیں تو یہ خلافِ حقیقت ہو گی گو امر واقعی ہو، اس کے بعد جو بھی تشبیہیں اس قسم کی اردو شاعری میں ملتی ہیں ان کی بنیاد یہی غالب کا انداز بیان ہے۔ چنانچہ بعد کو گستاخانہ یہ بھی کہا گیا کہ میں معشوق کے رخسار کے ساتھ چاند کو تشبیہ تو دیدوں مگر اس میں (وہ داغ) یہ کمی خامی کچھ تھوڑی سی ہے۔ شعراء تو رخسار اور جبیں کو چاند سے تشبیہ دیتے ہی آئے ہیں لیکن یہ برعکس مضمون بحد کمال مبالغہ لئے ہوئے جو ادا ہوا وہ غالب کا ہی ممنونِ احسان ہے۔

غرضکہ شاعرانہ کمال، تصویرِ حسن کی اداکاری میں یہی ہوتا ہے کہ بہت سی چیزوں کو دھندلکے میں چھوڑ کر اصل کیفیاتِ حسن بیان کی جاتی ہیں جن کا اثر دماغ

پر سننے والے کے پر پڑتا ہے کہ وہ ان کیفیاتِ حسن سے مسحور و متاثر جب ہوتا ہے تو اسے
لی چھوڑی ہوئی کیفیات بھی دل میں میٹھی میٹھی چٹکیاں ہر کا بی میں رہ کر لیتی ہیں اور
لذت کو دس گنا سے سو گنا بلکہ ہزار گنا بنا دیتی ہیں ۔ غالب کی منظر کشی کے یہ اشعار
یسی نظیر آپ ہیں ؎

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و ماہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

آخر شعر میں غالب نے بہار کے منظر کو حدِ کمال پر پہنچا کر درمیان میں ایک
محدود تخیلات کی وادی کو بے ساختہ چھوڑ کر یہ بتایا کہ افراط نشاطِ بہاری سے
ب سبزے کو کہیں جگہ نہ ملی کہ پورا عالم گل و گلزار تھا تو وہ بے چارہ سطحِ آب پر کائی
کر رہ گیا ۔ کائی پانی پر موسم بہار کی آخری منزل میں آتی ہے ۔ اور کوئی گلشن،
ت لاکھ گل بداماں ہو لیکن بغیر سبزے کے چارۂ کار نہیں ۔ یہاں اس کی
راط کو اس حسنِ تخیل پر پیش کیا کہ سبزہ و شادابی کے ہزاروں منازل اور مناظر
رد تخیر و عقل پیش کرتی ہوئی غالب کے اس آخری مصرعہ کو پڑھتی ہے اور سر دھنتی
۔ بس یہی چیز تھی جس نے غالب کو غلبہ بخشا اور پچاس سال غالب کے مرنے پر
ؤں کو اپنے دماغوں سے پچھلی شاعری کی جلی ہوئی کھرچن دور کرنے میں گذر گئے
ر اردوئے ادب کا دامن شعری اس قابل ہوا کہ اس پر گلگشتِ ادب کی وہ گلکاریاں ہو

جو غالب کی شاعری کی ممنونِ اثر ہنکر پھلیں پھولیں مہکیں۔ اب ہم اس عنوان کو اقبال
کے اس شعر پر ختم کرتے ہیں جو مرزا غالب کی شان میں ہے ؎
فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا　　ہے پرِ مرغِ تصور کی رسائی تا کجا

اصلاحِ شعر کا طریق

غالب اپنے وقت میں ممتاز الاساتذہ ہی میں شمار ہوتے تھے اور بڑھاپے تک آپ کو ہر روز
جو ڈاک آتی اس میں متعدد غزلیں بغرض اصلاح ضرور موصول ہوتی۔ اور غالب
انھیں غزلوں پر اصلاح دیکر مع محرّف شدہ الفاظ کے واپس کرتے تاکہ بھیجنے والے
کو یہ معلوم ہو جائے کہ کس لفظ کو بدلا ہے اور کیوں بدلا ہے۔ اگر کوئی غزل ایسی لکھی ہوئی
آجاتی کہ جس میں بین السطور، حاشیہ اتنا نہ ہوتا کہ جس پر اصلاح کی گنجائش ہو
تو غالب اس غزل کو دوبارہ بین السطور چھوڑ کر لکھواتے اور پھر اصلاح کے
بعد بھجواتے یہ کام غالب کی روزانہ زندگی کے مشاغل میں داخل تھا۔ اکثر غزلیں
اسی روز واپس اصلاح کے بعد کر دیتے

قاضی عبد الجمیل صاحب کے جوابِ خط کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:-

"پہلے خط کے حاشیہ اور پشت پر اشعار لکھے ہوئے ہیں سیاہی اس طرح کی
پھیکی کہ حرف اچھی طرح پڑھے نہیں جاتے اگرچہ بینائی میری اچھی ہے اور میں
عینک کا محتاج نہیں لیکن بایں ہمہ اس کے پڑھنے میں بہت تکلف کرنا پڑتا ہے
علاوہ اس کے جگہ اصلاح کی باقی نہیں۔ چنانچہ اس خط کو آپ کی خدمت میں
واپس بھیجتا ہوں تاکہ آپ یہ نہ جانیں کہ میرا خط پھاڑ کر پھینکدیا ہو گا اور
معہٰذا میرا اندیشہ آپ کو بھی معلوم ہو جائے اور آپ خود دیکھ لیں کہ انھیں

اصلاح کہاں دی جائے۔

واسطے اصلاح کے جو غزل بھیجئے اس میں بین الافراد، بین السطور فاصلہ زیادہ چھوڑیئے آپ کے خط میں جو کاغذ اشعار کا ہے حروف اس کے روشن ہیں مگر بین السطور مفقود اور اصلاح کی جگہ معدوم آپ کی خاطر سے رنج کتابت اٹھاتا ہوں اور ان دونوں غزلوں کو بعد اصلاح لکھتا جاتا ہوں مسودہ جو آپ کے پاس ہوگا اس سے مقابلہ کر کے معلوم کر لیجئے گا کہ کس شعر پر اصلاح ہوئی اور کیا اصلاح ہوئی اور کونسی بیت موقوف ہوئی۔

مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا قلعہ میں شہزادگان تیموریہ جمع ہوکر غزل خوانی کر لیتے ہیں وہاں سے مصرعۂ طرح کو کیا کیجئے گا اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھئے گا۔ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا۔ اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں، کیا معلوم ہے اب کے نہ ہو اور اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو۔"

ایک اور ٹکڑا غالب کے خط کا ملاحظہ ہو جو نواب انور الدولہ سعادالدین خان بہادر شفق رئیس کالپی کے نام ہے۔ "سن غالب ہم تجھ سے کہتے ہیں بہت مصاحب نہ بن لے ایاز حدِّ خود بہ شناس" مانا کہ تو نے کئی برس کے بعد رات کو نوبیت کی غزل لکھی ہے اور آپ اپنے کلام پر وجد کر رہا ہے۔ مگر یہ تحریر کی کیا روش ہے پہلے القاب لکھ پھر بندگی عرض کر پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خیر خبر پوچھ الخ۔ غرضیکہ یہ کئی سال کے بعد وہ بھی نوبیت کی غزل اور پھر اس پر اترانا بھی۔ معاملہ یہ ہے کہ مصاحب شاہ ہونے کے بعد پھر اردو شعر گوئی

تازہ کہ زندہ ہوئی تھی یہ اس کے دوسرے جنم کی سمجھو کہ بسم اللہ تھی تو اتنا بجا تھا۔ اور ملاحظہ ہو "منشی ہرگوپال تفتہ، المخاطب بہ میرزا تفتہ" (یہ غالب کا ہی پیار میں دیا ہوا اپنے ہندو شاگرد کو خطاب ہے جو استاد شاگرد کی یگانگت کو بتا رہا ہے اور یہ ہندو شاگرد اپنے "میرزا" ہونے پر مسرور ہے مگن ہے یہ بھی کوئی دور تھا۔) "تم اپنے کلام کے بھیجنے میں مجھ سے پرسش کیوں کرتے ہو۔ چار جز ہیں تو، بیس جز ہیں تو، بے تکلف بھیجدو۔ (جز کہتے ہیں کتابت پرنٹنگ میں سولہ صفحوں کی کاپی کو خرید و فروخت لکھنؤ میں نول کشور اور دوسروں کے یہاں اجزا اور پر ہی ہوتی تھی) میں شاعر سخن سنج اب نہیں رہا صرف سخن فہم رہ گیا ہوں بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی کون کا ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیونکر کہا تھا۔ قصہ مختصر وہ اجزا، جلد بھیجدو۔" کیا اظہار اخلاص ہے کہ آج قابل صد رشک ہے۔

غرضیکہ اصلاح غالب سے یہ امر بخوبی معلوم ہو گیا کہ مقصد اصلاح سے تربیت ہے۔ محض غزل بنا دینا مقصود نہیں ہے۔ چنانچہ کہ اصلاح مشکل چیز ہے نئی غزل لکھدینا سہل ہے یہی وجہ ہے کہ برسوں کیا بلکہ عمر بھر کی محنت کا ذوق کے یہاں ایک دیوان اور ظفر کے چار دیوان ذوق نے بنا دیئے کہ بنوا دیئے۔

ادبی خدمات۔ فارسی نظم، فارسی نثر۔ اردو نثر، اردو نظم، اردو خطوط نویسی۔

فارسی نثر، مہر نیم روز:- غالب نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے کہنے پر خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنی شروع

کی تھی۔ یہ اسکا پہلا حصہ ہے یہ ختم ہوا تھا کہ غدر ہو گیا اس میں ہمایوں تک کے حالات لکھے ہیں۔ دوسرے حصہ میں اکبر سے بہادر شاہ تک کے حالات لکھنے کا خیال تھا لیکن موقع نہ ملا اس کا نام ماہ نیم ماہ رکھنا چاہتے تھے صورت حال مہر نیم روز تصنیف کی یہ تھی کہ حکیم احسن اللہ خاں دربار کے شاہی طبیب مدار المہام مستند مورخ تھے وہ فارسی کتب سے تاریخی مواد غالب کو دیتے غالب اپنی فارسی انشاء پردازی میں اپنے اسلوب خاص پر ڈھالتے۔ مہر نیم روز کی زبان غالب کی ہے خیالات مطالب اور تاریخی مواد حکیم صاحب کے ہیں۔

دستنبو اس میں غدر کا حال لکھا ہے جو کچھ غالب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ رقم کیا ہے۔ غالب کا دعویٰ ہے کہ اس میں انھوں نے عربی سے پورا پرہیز کیا ہے یہ خالص ادب فارسی کی چیز ہے۔

پنج آہنگ اس میں فارسی انشاء پردازی کے نمونے ہیں۔

قاطع برہان اس میں خان آرزو کی لغت برہان قاطع کی غلطیاں ثابت کی ہیں کچھ دن بعد اس میں کچھ اضافہ کر کے اس کا نام درفش کاویانی رکھا۔

فارسی نظم۔ کلیات غالب اس میں فارسی کلام ہے کئی سواد بردس ہزار بیتوں پر مشتمل۔ اس میں غزلیں قصیدے، رباعیات، مثنوی سب ہی کچھ ہیں۔

فارسی نظم و نثر۔ سبد چین اس میں کچھ فارسی قصیدے، غزلیں اور کچھ خطوط ہیں۔

اُردو نظم و نثر

اُردو نثر - عود ہندی غالب کے خطوط کا پہلا مجموعہ جو غالب کی زندگی ہی میں مرنے سے چار مہینہ پہلے شائع ہوا۔ اس میں ایک سو باسٹھ رقعات ہیں۔ دو کتابوں پر تبصرہ اور تین کتابوں کے دیباچے بھی شامل ہیں۔

اُردوئے معلیٰ حصّہ اوّل غالب کے انتقال کے بیسویں روز یہ خطوط کا مجموعہ چھپ کر نکلا اسمیں بارہ سو بہتر خطوط ہیں۔

اُردوئے معلیٰ حصّہ دوم یہ غالب کے ۳۰ برس بعد شائع ہوا۔ اور اس میں مطبع مجتبائی کے مالک نے ایسے ۵۲ رقعے جمع کر دیئے جن میں غالب نے اپنے شاگردوں کے کلام پر اصلاحیں دیں یا شاعری یا زبان کا کوئی نکتہ بتایا ہے کچھ کتابوں کے دیباچے اور ریویو بھی اس میں موجود ہیں ۱۹۲۹ء میں شیخ مبارک علی لاہور نے اردو معلیٰ کے دونوں حصے یکجا شائع کئے ہیں۔ آخر میں اور تیئس ۲۳ غیر مطبوعہ خطوط جمع کئے ہیں۔

مکاتیب غالب یہ خطوط کا آخری مجموعہ ہے اس میں ایک سو پندرہ خطوط جمع کئے گئے ہیں جو غالب نے رام پور کے نوابوں کے نام لکھے ہیں۔ یہ مجموعہ ریاست کی طرف سے شائع ہوا ہے اور اسپر وہاں کے سرکاری کتب خانہ کے ناظم منشی امتیاز علی عرشی نے بڑا طول طویل دیباچہ لکھا ہے یہ

رقعے ادبی اعتبار سے کچھ زیادہ اہم نہیں ہیں۔ البتہ ان کی مدد سے غالب کے
حالات پر اور مزید روشنی پڑتی ہے۔

لطائف غیبی۔ تیغ تیز۔ نامۂ غالب۔ یہ تینوں رسالے قاطع
برہان کے جوابوں کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔

اُردو نظم —— اُردو دیوانِ غالب

یہ وہ غالب کا اردو دیوانچہ ہے جس میں غزل کے اشعار تقریباً بارہ سو ہیں اور قصیدے، رباعیات، مراثی، مثنوی اس کے علاوہ ہیں یہ خود مرزا کی حیات میں کئی بار چھپا اور اب تک صدہا بلکہ ہزاروں مرتبہ چھپا اور مرقع چغتائی کی شکل میں مصور بھی چھپا۔ اور اس کے پاکٹ ایڈیشن بھی چھپے۔ لوگوں میں یہی قبولِ عام کی شہرت رکھتا ہے۔ اگرچہ اس کی مقبولیت کا پیش منظر وہ ادبی خطوط ہیں جو اپنی ندرت پر شہکارِ فن ہیں۔ یہی وہ غالب کی اردو نثر نگاری ہے جس میں زبان و ادب پر تنقید ہے کتابوں پر تقاریظ ہیں۔ اور ہمعصروں سے ادبی چشمک ہے۔ غالب جن کی فارسی دانی کے کسی درجہ میں بھی قائل نہیں کہ "بوئے کچوری می آید"۔ بالکل ناقابلِ اعتماد سمجھتے ہیں اور ایک حد تک اس میں حق بجانب ہیں۔ کہ غالب اپنے خصوصی ماحول کے سبب جہاں پہنچے یہ وہاں نہیں پہنچ پائے۔

بہرحال یہ اردو دیوان ہی آج قوم میں وجۂ تعارف بنا ہوا ہے کہ ہندستانی مزاج قوم "تغزلی" ہے جس پر کچھ تو شہرت کا حاشیہ پھر اب تو دی

کی قلم "غالب" نے لگا دیا۔ مزید حاشیہ آرائی اب ہو رہی ہے کہ جشن صد سالہ غالب کا ۱۶ فروری ۱۹۶۹ء کو حکومت منا رہی ہے اور ادبی مراکز اور حلقوں میں بھی اس خصوص میں بہت کچھ ہو رہا ہے کہ غالب اور کلام غالب پر رخ رخ سے پہلو بہ پہلو سے روشنی ڈالی جا رہی ہے ہر طرح غالب کی غزلوں پر مشاعرے ہو رہے ہیں اور ایک خصوصی پروگرام کلام غالب کے ادبی تعارف کا حکومت اور قوم کے سامنے ہے۔ یہ اعزاز اگرچہ ایک صدی بعد دیا جا رہا ہے مگر کلام غالب اس میں بھی منفرد ہے جو کسی اور شاعر کو نہیں دیا جا سکا۔

نقد و تبصرہ بر تصنیفات

مرزا غالب کے پورے کلام پر تبصرہ کرنا اور اس کی حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرانا اک امر مستبعد ضرور ہے ایسے زمانے میں جبکہ ان کی جولانی طبع کا میدان کارزار اک فنکارانہ صورت میں ہے

فارسی بیں گر بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ   بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

پر تھا اور فارسی اس دیس میں پرجائی ہو کر رہ گئی ہے۔ خیر وہ پرجائی ہو کر رہ تو گئی ہے جہاں اس اردو کی جائی کی جان کے لالے پڑے ہیں۔ اس پر قلم اٹھانا بیحد مشکل ہے تاہم ہمارا روئے سخن غالب کو محسنان ادب اردو کی سر فہرست میں پیش کرنا ہے اس لئے ہم تصویر کے وہی رخ اجاگر کریں گے جو ہمارے موضوع سخن اور خصوصی مبحث سے متعلق ہوں۔

مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ اگر یہ نظریہ کوئی حقیقت رکھتا ہے کہ

"الشعراء تلامذ الرحمٰن" تو بے شک مرزا وہبی طور پر اس کے مستحق تھے۔ آٹھ نو برس کے بچے کی بساط ہی کیا کہ مرزا اردو کے قادر الکلام شاعر تھے۔ گیارہ برس کی عمر میں تو مرزا نے فارسی کے اشعار میں "چہ" بجائے "کہ" استعمال کیا پھر اپنے استاد شیخ معظم کی لاعلمی کی برہمی کو ظہوری کی سند دکھا کر لاجواب کیا۔ میر تقی میر بھی مرزا کے ہم وطن تھے ان کے لڑکپن کے اشعار سن کر کہا بولے تھے کہ اچھی تربیت ملی تو کچھ بن جائیگا ورنہ بکواسی رہے گا۔

میر کی وفات کے وقت مرزا کی عمر تیرہ چودہ برس کی تھی۔ مرزا کے اشعار میر تقی میر کو ان کے بچپن کے دوست نواب حسام الدین حیدر خاں نے دکھائے تھے۔ اگرچہ مرزا نے بچپن میں میرزا عبدالقادر بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا جو مرزا کی طبیعت ثانیہ بن گیا تھا جس کے اغلاق سے حلقہ احباب ہموزا کا نالاں تھا۔ اور میر صاحب کی پیشنگوئی پوری ہونے والی تھی کہ مرزا کے دوست مفتی صدرالدین خاں آزردہ کے کچھ اثر سے اور مولوی فضل حق خیر آبادی کے پورے اثر سے اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی بجا فہمائش سے مرزا نے اغلاق بازی سے توبہ کی گویا یہ مرزا کے مربی بھی خواہ استاد کامل کے روپ میں مرزا کے مصلح ٹھہرے ورنہ کہاں مرزا کا مقام اور کہاں اس کی استادی کا کسی کو شرف۔

میر سے لیکر ذوق تک جتنے مشہور غزل گو شاعر مرزا کے سوا اہل زبان گذرے ہیں ان کی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں گے جو ایک محدود دائرہ میں بند نہ ہوں۔ ان کی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضمون پہلے متعدد جگہ بندھ چکا ہے وہی کسی ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جائے کہ تمام اگلی بندشوں

سے سبقت لے جائے۔ برخلاف مرزا غالب کے آپ نے اپنی غزل کی عمارت نئی بنیادوں پر قائم کی۔ ان کی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں جن کو دوسرے شعراء کی فکر نے بالکل مس نہیں کیا۔ معمولی مضامین بھی نرالی جدتِ ادا کی نزاکتوں سے ادا ہوتے ہیں جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اوروں نے پچھلوں کی تقلید کی شاہراہ سے قدم باہر نہیں نکالا۔ اور مرزا کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر لفظ کو قدرت نے ایک ہی معنیٰ کے لئے عین حقیقت پر وضع کیا ہے ایک لفظ میں متعدد معنیٰ مرکز سے ہٹ کر ادا ہوں تو ہوں لیکن حقیقی معنیٰ اس کے ایک ہی ہوں گے جو اس کے لئے سراپا موزوں ہوں گے لفظ پورا پورا اس پر دلالت کریگا اور وہ معنیٰ پورے پورے اس کے مصداق ہوں گے اس لئے چند اشعار مرزا کے عنوانوں کے تحت پیش کر دینا مناسب نظر آتا ہے۔

اخلاق:۔ "بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"

بظاہر یہ معمولی بات ہے غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے دعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں سبھی کام آسان نہیں ہوتے اور دلیل یہ ہے کہ سبھی آدمی، آدمی ہیں۔ لیکن سبھوں کو انسان نہیں کہتے آدمی، آدمی انتر کیا ہیرا کیا کنکر۔

علوئے ہمت:۔ "توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا"

بالکل نیا اور اچھوتا خیال ہے نہایت عمدگی سے اس کو ادا کیا ہے۔
دعوئی ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے اسی قدر تائید غیب سے ہوتی ہے ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جس کو آنکھوں میں جگہ ملی ہے اگر اس کی ہمت دریا میں موتی بننے پر قانع ہو جاتی ؎ تو ظاہر ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کان سے کان میں آتا آنکھوں میں جگہ نہ پاتا ظاہر ہے کہ آنکھوں کا رتبہ کانوں پر بھاری ہے۔

برداشت ؎ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یہ خیال بھی بالکل اچھوتا ہے جو اس خوبی سے ادا ہوا کہ اس سے زیادہ تصویر بیان نا ممکن ہے مشکلات کی کثرت کا اندازہ اس کی حقیقی ضد یعنی ان کے آسان ہو جانے سے کرنا در حقیقت حسن مبالغہ کی معراج کمال ہے کہ وہی عادت تانیہ بنگئی ہے "درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا" بتانا یہ ہے کہ خلاف فطرت اور ضد طبع بھی کوئی چیز جب داخل عادت ہو جائے تو دکھ نہیں رہتی۔ ہم سنکھیا کھائیں تو عدم آباد کو سدھاریں۔ لیکن عادت کے بعد لوگ ڈلیاں پھانک لیتے ہیں اور کچھ نہیں ہوتا یعنی احساس اٹھ جاتا رہتا ہے۔
دھوپ میں پھر و تو پسینہ پسین ہو جاؤ پھر اسی دھوپ میں دھوپ کا چشمہ لگا کر پھر و تو کچھ بھی تیزی حرارت نہ محسوس ہو۔

قناعت ؎ "اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے"

جام جمشید جہاں نما پر اپنے مٹی کے آبخورے کو کس خوبی و لطافت سے ترجیح دی

ہے۔ جو تعریف سے بالاتر ہے کہیں ایسا خیال نظر سے نہیں گذرا۔ انسانی فطرت

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

کہ یہ ہو جاوے ہو جایے امنگیں ہوس کی فطرت ہی ہیں اگر مرنا نہ ہو تو جینے کا مزا بھی نہ ہو اسے پھر جیتا بھی کون کہے یہ تو مرنے کے خدشہ نے جینے کی قدر بڑھادی ہے خدا معلوم کب موت آجائے اس لئے یہ بھی کرلوں وہ بھی کرلوں پھر مرے پیچھے کون آیا ہے یہ انسان کی اک طبعی خصلت ہے کہ جس قدر فرصت کم ہو اسی قدر زیادہ سرگرم عمل نظر آتا ہے جتنی زیادہ مہلت اتنی ہی زیادہ سہل انگاری۔ اس جذبہ کو نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا۔ کس انوکھے اسلوب سے اور نرالی جدت سے اور اک جامع پیرائے میں ادا کیا ہے کہ مرنا تو معلوم نہیں مگر ہے ضرور اس لئے خدا معلوم موت کب آجائے ہوس بحران پر ہے کہ یہ وہ اور وہ سبھی کچھ ہو جائے جو عرصۂ حیات میں ممکن ہو اسے ایک لفظ "جینے کا مزا" کیا میں سمو دیا ہے اگرچہ عربی شاعر متنبیؔ کے یہاں یہ مضمون بندھا ہے اول تو غالب کی نگاہ وہاں تک کہاں پہنچی ہوگی توارد بھی کہا جائے تو بھی وہ جامعیت متنبی کے یہاں نہیں وہ جزئیات میں بہہ گیا اور غالب نے قاعدہ کلیہ ہی بیان کردیا متنبی کا یہ شعر ہے

"لا فضل فیها للشجاعة والندی

وصبر الفتی لولا لقاء شعوب" — یعنی اگر موت

کی گھاٹی سے گذرنا نہ ہو تو بہادری ہو کہ سخاوت کہ صبر و تحمل یہ چیزیں بے فضیلت بے جوہر ہو جائیں موت سے ان کی قدر و منزلت ہے کہ مرنے کے بعد تو ہم رستم زماں، حاتم وقت اور نوشیروانِ عصر کہلائیں گے حالانکہ اخلاق فاضلہ انسانی فطرت کے اور بھی بہت کچھ

جو متنبی کے یہاں نہیں آسکے اور غالب نے جینے کا مزا کیا " کہہ کر پوری کیفیات انسانی
کی بدمزگی کا اعلان کر دیا کہ بے موت یہ مصیبت کر رہی ہے ۔ موت سے ہی ہر بلکہ فضیلت
کو برتری ہے ۔ ترجیح بر حق ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

نیستی کو ہستی پر کس انوکھے انداز سے ترجیح دی ہے جسمیں یہ بھی ایماء ہے کہ
نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا ۔ خدا ہوتا یعنی سبھی کتم عدم سے وجود میں آ رہے ہیں اور ان
کو خالق کون و مکان لا رہا ہے تو جب عالم نہ تھا تب بھی تو خالق عالم خدا تھا کہ اسکا
وجود ازلی، ابدی ہے بہر حال خدا تو تھا ہی ایسا ہی جب کچھ نہ ہوتا یا کچھ بھی نہ ہو تو بھی
خدا تو ہو ہی گا ۔ تو اصل وجود اس کا لائق وجود ہے ہمارا ہونا نہ ہونا برابر ہے ہم تو
موجود ہو کر مشخص ہو کر کھوئے گئے نہ پیدا ہوتے تو اس لزوم فنا کی ذلت سے بھی بچتے
اور ہم بھی خدا نہ ہوتے تو بھی خدا ہی میں تو ہوتے کہ وہیں سے تو سب آ رہے ہیں ۔
کیا سکنت اور برتری کا سنگم پیش کیا ہے ۔ تیسری فضیلت :۔

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

بیچارہ طور جل کر سرمہ ہو گیا برق جلوہ کی تاب نہ لا سکا ۔ اور ہم جنہوں نے
ہمہ بے بضاعتی کے باوجود بار امانت اٹھا لیا جہاں کائنات لرز اٹھی یہ برق تجلی بھی ہم
پر گرتی کہ ہم تحمل والے تھے ۔ سوز میں بھی اور ساز میں بھی بہر صورت ہم لطف اندوز
ہوتے جلتے کہ مرتے ۔ شکایت اہل وطن سے

مجھ کو دیار غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

پردیس میں مرنا بیحد تکلیف دہ ہے مرزا اس پر خدا کا شکر کرتے ہیں کہ

پردیسی بیکسی کے سبب یہاں بے گور و کفن مرجاتے ہیں زیادہ کوفت اور وہاں یہ ہرج نہیں کہ
پردیس ہی کون جانے یہ کس رتبہ و مقام کا ہے وطن میں مرنا جہاں اک زمانہ واقف حال ہو
اور غمخوار کوئی بھی نہ ہو وہاں یہ مٹی خراب ہوتی تو ناقابل برداشت ذلت اور رسوائی کی
حاصل ہوتی۔ صد شکر حق کہ اس پردیسی موت نے اس بیکسی کی لاج رکھ لی۔ تصوف سے

ہر غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

جس کو ہم نے عالم حضوری سمجھ لیا ہے یہ ہماری ہمت نارسا کی حد انحطاط ہے ورنہ یہ
تو غیب کا بھی غیب ہے مرتبۂ احدیت ذات کن فیکان عقل و ادراک اور فراست سے وراء الورا
ہے ہم اس غلطی میں ایسے ہیں جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ وہ خواب سے بیدار ہوا تو اس
کا یہ خواب سے جاگنا بھی تو خواب ہی میں ہے وہ بھی تو خواب ہی رہا حقیقت کہاں ہوا

قدر اہل ہمت سے

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

کہتے ہیں کہ دنیا میں اہل ہمت کا کال ہے یہاں اہل ہمت ہوتے جو دنیا کو ایک زہر
عارضی، فانی چیز سمجھ کر اس کی طرف التفات نہ کرتے اور دنیا ویران ہو جاتی سو وہ
اہل ہمت نہیں اور ان کے نہ ہونے سے عالم آباد ہے پھر اس کی اک اچھوتی تمثیل سے
وضاحت کرتے ہیں کہ میخانہ کی یہی رونق ہے کہ جام و سبو بھرے پڑے ہیں اور اگر اہل
ہمت ہوتے تو سب پی کر تلچھٹ بھی نہ چھوڑتے پیر مغاں گھوڑے بیچ سو جاتا اور میخانہ
میں خاک اڑتی۔ اس لئے اہل ہمت کے نہ ہونے سے یہ وہاں کی آبادی ہے کہ دوکان
میں سامان خوب بھرا پڑا ہے۔
غرضیکہ مرزا کے ہر شعر کو ایک عنوان بھی دیا جائے تو مرزا کی جدت طبع آپسے بھی

پایۂ ثبوت کو پہونچا دیگی اسی لئے ہم مختصراً مرزا کے کلام نظم و نثر پر بالاجمال ایک جھلک بطور تبصرہ پیش کرتے ہیں کہ آپ مرزا کے حدود ابلاغ کا فی الجملہ مطالعہ کر لیں گے اور اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ع "شاعری تصویر ناطق ہے دلی جذبات کی"۔

واقعی یہ صداقت کلام غالب میں پائی جاتی ہے تفصیلات ملاحظہ ہوں

فارسی نظم:- مرزا نے بچپنے سے ہی فارسی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا فارسی کا سرمایہ بارہ تیرہ ہزار تک ملتا ہے جسمیں ساڑھے چار ہزار شعر صنف غزل اور دو ہزار سے زیادہ صنف مثنوی میں لیکن اردو مثنویاں بھر صرف دو ہیں ہیں۔ صفت انبہ۔ پتنگ وغیرہ لیکن ان کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ در اصل دو ہی ہیں۔ انبہ اور پتنگ کی مگر ان کو بھی مثنوی کہنا کہاں تک موزوں ہے یہ اہل سخن پر موقوف ہے ہمارے خیال میں تو یہ ایک نظم مسلسل کا درجہ رکھتی ہیں کہ مثنوی میں کبھی تو پلاٹ اور مواد قصہ ہوتا ہے ہیرو ہیروئن کے ساتھ افراد قصہ ہوتے ہیں وہ حزنیہ المیہ ہو کہ طربیہ) باقی قصائد۔ قطعات ترکیب بند ترجیع بند وغیرہ ہیں۔ انہوں نے ۶۴ فارسی قصیدے لکھے ہیں جن میں بارہ حمد و نعت اور منقبت مدح ائمہ میں باقی ۵۲ قصیدے شاہان دہلی و اودھ۔ نوابان رامپور، اور انگریزی عہدیداران اور دوستوں محسنوں کی تعریف میں۔ اصل میں ان کا کمال سخنوری ان قصیدوں ہی سے ظاہر ہوتا ہے قصیدوں کے بعد مثنویوں کا درجہ ہے جو کل گیارہ ہیں جن میں چراغ دیر، باد مخالف اور ابر گہر بار خاص طور پر قابل ذکر ہیں غزلیں زیادہ تر مرزا بیدل کی تقلید میں لکھی گئی ہیں۔ اور ان کی طبیعت کا خاص رنگ جو اردو غزلوں میں نمایاں ہے وہ فارسی غزلوں میں بھی موجود ہے اور دہیں سے تو در اصل

اُردو میں آیا ہے۔

مجموعے۔ کلیات

۱۸۳۵ء اڑتیس سال کی عمر تک مرزا کے فارسی کلام کا ذخیرہ "میخانۂ آرزو" کے عنوان سے مرتب ہو چکا تھا مگر یہ کلیاتِ نظم دس سال تک شائع نہ ہو سکا نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّرؔ درخشاں کی تصحیح و ترتیب کے بعد ۱۸۴۵ء میں مطبع دار السلام دہلی میں چھپا اس کے بعد کا کلام غدر میں لٹ گیا۔ اس کے بعد منشی نول کشور نے نیّر کے فرزند شہاب الدین احمد خاں ثاقب سے بقیہ کلام لیکر کلیاتِ نظم فارسی کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۳ء میں چھاپا۔

ابرِ گہربار

غالب کی یہ سب سے بڑی مثنوی ہے جس میں گیارہ سو سے زائد شعر ہیں مرزا کا ارادہ تھا کہ شاہنامۂ فردوسی کے رنگ میں غزواتِ نبوی کو منظوم کیا جائے لیکن صرف تمہیدی حصہ یعنی حمد و نعت و منقبت اور عرض حال وغیرہ لکھ سکے تھے کہ خیال چھوڑ دیا۔ یہ کام بہت اہم اور اطمینان قلب کا تھا جو مرزا کو عمر بھر نصیب نہ ہوا یہ ناتمام مثنوی کلیات میں شامل ہے مگر بات یہ ہے کہ ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست　　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہ نعمت اردو شاہنامۂ اسلام حفیظ جالندھری کے مقسوم میں تھی۔ حکیم غلام رضا خاں کے اصرار پر مرزا نے اس کو علیحدہ چھاپنے کی اجازت بھی دیدی تھی کہ اس میں معراج مبارک کا قصہ شرح و بسط کے ساتھ منظوم ہوا ہے جو بجائے خود اک مستقل کتاب ہو گیا تھا۔ اب بحالتِ موجودہ اس مثنوی کا یہی موضوع ماحصل ہے جب یہ مثنوی ۱۲۸۰ھ اکمل المطابع میں شائع ہوئی تو اس کے ساتھ چند رباعیات دو قطعے اور دو قصیدے بھی شامل کر دیئے گئے جو کلیات میں شامل نہ ہو سکے تھے۔

پہلا قصیدہ لارڈ الگن اور دوسرا لارڈ لارنس کی مدح میں ہے۔ یعنی جنت کی بہار دن
میں جہنم کی خزاں کے جھونکوں کا تصوّر ہی بھی ضرور رہے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے

سبد چین کلیات کی طباعت کے بعد مرزا نے جو قصائد، قطعات، اور دوسرا کلام لکھا اسکو "سبد چین" کے نام سے ۱۸۶۷ء میں مطبع محمدی نے شائع کیا۔ پھر اک عرصہ نایاب رہ کر ۱۹۳۸ء میں مکتبہ جامعہ نے جید برقی پریس دہلی سے شائع کیا اور اس اڈیشن میں غالب کا منتشر کلام بھی شریک کر دیا گیا۔ اس مجموعہ میں ایک قصیدہ نواب کلب علی خاں والی رامپور کی شان میں بھی ہے۔

فارسی نثر

مرزا جتنے اچھے شاعر تھے اتنے ہی اعلیٰ درجہ کے نثر نگار بھی تھے۔ ان کی انشا پردازی ان کے عنفوانِ شباب سے شروع ہوئی اور چالیس سال تک جاری رہی، درفش کاویانی، اور اردو خطوط نویسی کے آغاز کے بعد مرزا نے فارسی میں لکھنا ترک کر دیا۔

پنج آہنگ یہ مرزا کی پہلی تصنیف ہے ۱۸۲۵ء میں جب انگریزوں نے بھرت پور پر چڑھائی کی تو غالب کے چچیرے خسر نواب احمد بخش خاں انگریزوں کی طرف سے فوج میں تھے مرزا غالب اور ان کے حقیقی سالے علی بخش خاں رنجور بھی ساتھ تھے۔ رنجور نے مرزا سے فرمائش کی کہ آپ کوئی ایسی کتاب لکھدیں جس کے مطالعہ سے القاب و آداب اور خطوط نویسی کے لوازم سے آگاہی ہو۔ چنانچہ مرزا نے کتاب کے ابتدائی دو حصے اس سفر میں لکھے پھر جملہ پانچ حصے پورے

کر کے "پنج آہنگ" نام رکھا۔ چنانچہ ہر حصے کی تفصیل یہ ہے۔
آہنگِ اول۔ القاب و آداب اور ان سے متعلقہ مراتب۔
آہنگِ دوم۔ مصادر و مصطلحات لغات فارسی۔
آہنگِ سوم۔ مثالیہ اشعار منتخب از دیوانِ غالب فارسی۔
آہنگِ چہارم۔ کتابوں کے خطبے، تقریظیں اور متفرق عبارتیں۔
آہنگِ پنجم۔ مکاتیب۔

لیکن یہ فارسی خطوط اور منتشر تحریروں کا مکمل مجموعہ نہیں کیونکہ غدر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں اور حسین مرزا کے کتب خانوں سے جو تحریریں ضائع ہوئیں ان کے علاوہ اور بھی کچھ خطوط اور تحریریں اس میں شامل نہیں ہیں یہ کتاب کلیاتِ نثر میں بھی شامل ہے جو کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔

مہرِ نیم روز

جب انگریزوں کے اثر اور ان کی کوششوں سے ان کے ایک معتمدِ خاص کو مدار المہام کے عہدے پر تقرر سیاسی مصالح یعنی سی، آئی، ڈی، کے فرائض انجام دینے پر ہوا تو یہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر شاہ کے مدار المہام اور وزیر مقرر ہوئے۔ یعنی قلعہ اور اس کے اندرونی معاملات میں دخیل کار ہوئے تو انہوں نے دربار میں انگریزوں کے دیگر بہی خواہان کے لئے بھی جگہ پیدا کر لی مرزا غالب جو انگریزوں کے پینشن خوار اور وفادار نمک حلال بہی خواہ تھے اور ابتک اسی جرم کے سبب دربار میں جگہ نہ پاسکے تھے۔ یہ حکیم صاحب کے خاص دوستوں میں تھے حکیم صاحب کی توجہ دلانے پر کہ غالب جیسا ادیب اور نامور شاعر شہر میں رہتے ہوئے شاہی دربار سے متوسل نہ ہو تعجب ہے

چونکہ ذوق موجود تھے اس لئے بادشاہ نے مرزا کو شاہی مورخ کی حیثیت سے ملازم رکھا جس سے مرزا کو کوئی دلچسپی نہ تھی مرزا کے انکار پر حکیم صاحب نے یہ انتظام کیا کہ تاریخی مواد اور معلومات خود مرتب کر دیتے جن کو مرزا اپنے اسلوب خاص میں قلم بند کر دیتے ۴ جولائی ۱۸۵۰ء سے تاریخ نگاری کی ملازمت شروع ہو کر غدر تک چلی اس حصہ کا نام پرتوستان رکھا تھا اس کو دو حصوں پر منقسم کیا پہلا حصہ "مہر نیم روز" جس میں آغاز سلطنت تیموریہ سے ہمایوں تک کے حالات لکھے ہیں۔ دوسرا حصہ جو "ماہ نیم ماہ" کے نام سے لکھنا چاہتے تھے جس میں اکبر سے بہادر شاہ تک کے حالات درج کرتے کہ غدر ہو گیا اور کتاب کا صرف نام رہ گیا۔

دستنبو غدر کے ساتھ ہی قلعے کا آنا جانا موقوف ہوا تو مرزا نے بیکاری میں غدر کے حالات قلم بند کئے جو دستنبو کے نام سے مشہور ہیں یہ کتاب متعدد مرتبہ انھیں دنوں مختلف جگہوں پر چھپ چھپا کر ختم ہو گئی مرزا کو اس کتاب کے صلہ میں بہت کچھ توقعات انگریزوں سے پانے کی تھیں ہوا وہی کہ "کوہ کندن و کاہ برآوردن"۔ نیز اس پر نماز بخشوانے اور روزے گلے پڑے کہ اُلٹے مرزا صاحب "سکے جاری کرنے کے غلط الزام" میں مورد عتاب ٹھہرے "خوئے بد را بہانہ بسیار"۔ اور تنخواہ مفت میں پنشن بھی گنوا بیٹھے اور دار و رسن پر لٹکتے لٹکتے بچے۔

کلیات نثر ۱۸۶۰ء میں جب منشی نول کشور دہلی آئے تو انہوں نے مرزا سے کلیات نثر فارسی کے چھاپنے کی اجازت لے کر

دو تین مرتبہ چھاپی۔

قاطع برہان غدر کے زمانے میں دستنبو کے علاوہ مرزا نے مشہور فارسی لغت "برہانِ قاطع" پر بھی حاشیے لکھنے شروع کئے جب پوری کتاب دیکھ ڈالی تو حاشیوں کو یک جا جمع کر کے "قاطع برہان کے نام سے علیحدہ لکھوائی جو ۱۸۶۲ء میں نول کشور میں چھپی۔

درفشِ کاویانی قاطع برہان کی اشاعت سے جو علمی ہنگامہ ان کے خلاف درشت لب ولہجہ پر برپا ہو گیا تھا۔ پرانے طرز کے لوگ جس سے چراغ پا تھے مرزا کے خلاف کئی رسالے ساطع برہان قاطع القاطع۔ محرق قاطع۔ مواعظ برہان۔ شمشیر تیز تر۔ وغیرہ اور مختلف خطوط (پمفلٹ) شائع ہوئے۔ مرزا نے بھی جن کے جواب لکھے اور لکھوائے۔ تیغ تیز۔ لطائف غیبی۔ دافع ہذیان۔ نامۂ غالب۔ اور سوالات عبدالکریم۔ اسی سلسلے میں لکھی گئی ہیں۔ اس زمانے میں مرزا کی پریشانی اور کلکتے میں ان کے خلاف مخالفت کا طوفان۔ گمنام خطوط میں گالیوں کی بھرمار مرزا کے لئے کافی تردد لئے وجۂ بدگمانی تھی اور مرزا خاصے پریشان تھے۔ دو تین سال کے بعد جب کچھ فضا سرد پڑی تو مرزا نے مزید مطالب اور اعتراضات کا اضافہ کر کے قاطع برہان کو درفش کاویانی کے نام سے اکمل المطابع سے ۱۸۶۵ء میں شائع کرایا۔

اُردو نظم:۔ مرزا غالب نے اپنے بچپنے ہی سے اپنی شاعری کی اردو ہی سے ابتداء کی تھی کہ یہی ان کی اپنی مادری زبان تھی وہ لاکھ ڈینگیں

ماریں۔ فارسی ولایت زادوں سے ہمسری، برتری کی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خود غالب نے اعتراف کیا ہے انھوں نے کبھی خود کو فارسی کا اہلِ زبان نہیں کہا بلکہ یہ کہا کہ "میں تو آگرہ میں پیدا ہوا۔ میرا دادا ترکمان سمرقند سے ہند آیا اور میری نشو و نما دلی میں ہوئی۔ میں اہلِ زبان کہاں کا۔

میں بے شک زبان داں ہوں یعنی تمہارے مقابلہ پر کچھ زیادہ فارسی جانتا ہوں کہ مجھے کچھ ایسے موقعے ملے جو تمہیں میسر نہ تھے" اس قدر صاف گوئی پر بھی غالب کے ہم عصروں نے اپنی معمولی فارسی کی شُد بُد پر غالب کو نہ بخشا اور غالب سے ٹکر لی خواہ مخواہ کی۔ جو انھیں کسی طرح بھی جائز نہ تھی۔

مادری زبان کی بالکل سائنٹفک، جچی تُلی یہ تعریف ہے کہ "مادری زبان وہ کہلاتی ہے جس میں آدمی سپنے دیکھے"۔ جتنی ترقی فطرتاً انسان اپنی مادری زبان میں کر سکتا ہے دوسری زبان میں نا ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ذوق کے مقابلہ پر غالب سے جب کچھ بن نہ آیا تو انھوں نے اپنے اردو کلام کو ہی باعثِ ننگ کہہ دیا کہ ہماری فارسی کے رنگ ہائے رنگ دیکھو۔ بیچارہ وہ ذوق ع کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر۔ جو دکن بھی نہ جا سکا۔ جس نے کبھی خواب میں بھی ایران نہ دیکھا ہو۔ وہ ایک تورانی زادے کے مقابلے پر فارسی میں کیا آ سکتا تھا۔ مرزا نے اپنے اس شعر

بگذر از مجموعۂ اردو . . . . .

میں دامن بچانے کی فکر کی ہے۔ ہمارا روئے سخن اس تقابل میں جمہوریت

بالکل متضاد ہے۔ ذوق کا ذوق اپنی جگہ ہے اور غالب کی جدت طرازی اپنی جگہ اسوقت ہمارا موضوع سخن چونکہ "سیر غالب" ہے اور ہم موضوع سے ہٹ کر کچھ کہنا بھی زیادہ مناسب نہیں سمجھتے تاہم کچھ سرِ راہے آجائے تو چنداں مضائقہ ہم ندارد۔ کہ ہم اس تقابل کو بالکل لایعنی سمجھتے ہیں۔ جہاں ہم غالب کی مدحت طرازی میں ہزاروں صفحات لکھ سکتے ہیں وہیں ہم چار سطریں بھی کیا ذوق کی منقبت میں نہیں لکھ سکتے؟ بلکہ ہزاروں نہوں تو سینکڑوں صفحوں کی ثنا خوانی کا ذوق بھی مستحق ہے۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے آزاد کی طرح کہ آب حیات میں اپنے استاد ذوق کے لئے درجنوں صفحات اور بے چارے غالب کے لئے کل ڈھائی صفحہ۔ بلکہ ہمارا کلچر اور ہمارا معاشرہ ہماری زبان ہمارا ادبی تمدن سبھوں کا محتاج، اور سبھوں کا قدر دان ہے۔ وہ استاد ذوق ہوں یا کوئی اور۔ اہل فن قصر تمدن کی تعمیر میں جہاں بنیادوں میں سمینٹ پتھر اور دوسرے سامان استحکام زمین میں دفن کر دیتے ہیں یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ بے کار سپرد خاک ہوئے۔ ان کی بھی اتنی ہی قدر و منزلت ہے جتنی دیواروں اور چھت اور پلاسٹر کی۔ پیٹ بھرنے کے لئے غلہ چاہیئے اور میوہ جات تفنن طبع کے لئے ہوتے ہیں۔ بنفس الامر میں ذوق و غالب کا یہی مقام ہے کہ ذوق نے اپنی پختہ کاری سے ہمیں جو ادبی غذا پیٹ بھر اودی ہے اسی کے اوپر ہم غالب کے پھلوں سے نقل کا کام لیتے ہیں تو لطف اندوز ہیں ورنہ خالی پیٹ یہ کلام غالب چاہے انگور و سیب ہو یا قلاقند برفی ہماری ادبی بھوک نہیں مٹا سکتا۔ اور ہمارے لئے وجہ حیات نہیں بن

سکتا۔ ہمیں اپنے ادب کیلئے سبھوں کی قیادت لازمی ہے۔
"ہر گل را رنگ و بوئے دیگر است"
نیز "ہر کسے را بہر کارے ساختند"۔ قوم کی یہی افراتفری ناقابلِ عفو ہے جب ذوق کی پوجا کا بسنت پجتا تھا تو غالب کو ہمہ نوقیت قوم بھولے ہوئے تھی جب غالب کے محاسن کا شعور ہوا تو ذوق کی بدذوقی اچھالنے پر ہے۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو آپ کو معلوم ہو جائے کہ بادشاہوں کے ساتھ شطرنج کھیلنا ہر کس و ناکس کے برتے کا نہیں ہے۔ کھلاڑی کی فطرت اور اس کا طبعی تقاضا یہی ہوتا ہے کہ وہ جیتے اور بادشاہ کے ساتھ یہ کھیل کھیلا نہیں جاتا بلکہ بادشاہ کو کھلایا جاتا ہے تو یہاں کے نفسیات یہ ہوتے ہیں کہ شاہ سے ہار میں ہی اپنی جیت ہے کہ شاہ جیت کر خوش ہو۔ اور ہمارے کام نکلیں۔ یہاں جیت میں ہار اور ہار میں جیت ہے۔ تو اس تمثیل کی روشنی میں کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ شاگرد شاہ ظفر تو چار دیوانوں کا دیوانہ چاروں کا مالک اور بے چارہ استادِ ذوق صرف ایک دیوان کا وہ بھی آزاد جب کو چھاتی سے لگا کر پنجاب لے گئے کہ لوٹ سے بچا ورنہ وہ بھی کب کا چمنا بُرد ہو چکا ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ شاہ کی غزلوں پر اصلاح دینے کے بعد انسانی طاقت سے یہ باہر کا مسئلہ ہے کہ وہ لاکھ قادر الکلام شاعر ہو۔ چار بول بھی موزوں نہیں کر سکتا۔ کرے تو آمد کی جگہ توارد کا مورد الزام ٹھیرے اصلاح کے بعد دماغ کا خزانہ بالکل خالی ہو جاتا ہے یہ امر بے حد کارے دارد کہ

اچھی غزل اصلاح کے بعد کوئی اپنی انفرادیت کو باقی رکھ کر لکھ سکا ہو۔ یہ تجربہ ہمیں کافی ہے کہ جب کسی مشاعرے کے لئے کوئی غزل کہی اور متوسلین کے کلام کی اصلاح بعد کو دی تو غزل کا رنگ اور تھا۔ اور اصلاح کے بعد اپنی غزل لکھی تو اور رنگ رہا۔ جگہ جگہ توارد کے جھٹکے لگتے اور قلم روکنا پڑتا۔ یہ استادِ ذوق کا ہی کمالِ اعجاز ہے کہ اس نے شاہ کے بھی چار دیوان لکھوا دیئے اور اپنے لئے بھی فربہ نہ سہی ایک معتدل ضخامت کا دیوان چھوڑا جو غالب کے دیوانچہ سے کہیں بڑا ہے۔

ہمارا خیال بچپنے سے یہی تھا کہ اگر غالب کا اور ذوق کا موازنہ ایسا ہی ضروری سمجھا جائے تو دیوانِ ذوق سے اتنے ہی شعر انتخاب کر لئے جائیں جتنے غالب کے یہاں ہیں پھر تقابل بھی ہو تو یہ شتر گربگی نہ ہو۔ اگر ایسی ہی کشتی کی جوڑ توم چاہتی ہے تو ذوق کی جگہ مومن ایک حد تک غالب کے ہم مزاج اور قدرے ہم رنگ ہیں۔ مگر یہاں تو اس کا پس منظر کوئی ادبی پہلو نہیں ہے۔ صرف یہ جذبہ ہے کہ ملا ذوق کیوں اور کیسے استادِ شہ ملک الشعراء بن گیا۔ اور غالب کیوں نہ بنے ہم بتا چکے ہیں کہ غالب کی انگریز پرستی کیوجہ سے ایسے ہوا اور نہ حق ملک الشعرائی غالب کا ہی تھا۔

اور ملک و قوم کو تو ہر دو عزیز ہیں کہ استاد ذوق کی شاعری ہیں ہمارے لئے اور ہماری زبان کے لئے روزمرہ محاورے ہیں اور کوئی ادنیٰ سا بھی سقم شعری عیوب سے نہیں ہے۔ اور ہمیں غالب کے غلبہ سے بھی کب انکار کہ ہماری شاعری کی معراج کمال غالب ہی کی بدولت ہے فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

یہ میرا اپنا مذاق ہے۔

الحاصل۔ مرزا نے اردو میں طرزِ بیدل میں جو کچھ لکھا وہ سب آج دریا برد ہے کاش کوئی شیفتہ کہ حالی ذوق کو بھی میسر آتا کہ وہ بھی اس کے دیوان کو دیوانچہ بنا دیتا وہاں تو یہ مصیبت ہے کہ جو ملا رطب و یابس جمع کر دیا گیا اور اوپر عنوان لکھدیا "نظر ثانی سے نور نہ پایا" پھر بھی کوئی ادبی سقم زبان و قواعد عروض و قوافی کا ہم نے ذوق کے یہاں نہ دیکھا۔ یہی قدرت کے تکوینی تقاضے ہیں ہمیں اپنے ادب کے تنوعات کی پھر قدر و منزلت کیسے معلوم ہوتی۔

غالب نے میر و درد کے انداز میں جو لکھا ہے اس کے سبب، وہ آج ایک بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ مرزا کی شاعرانہ عظمت کا سہرا دراصل مولانا فضل حق کے سر ہے جنہوں نے ان کے کلام کا رنگِ سخن کیا بدلوا دیا زنگِ سخن دور کیا ورنہ آج بھی لوگ وہی کہتے جو کل کہتے تھے ؎

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال　　　　پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

غالب کا انتخابی کلام ۱۲۵۷ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں فخر المطابع دہلی سے شائع ہوا جس کے آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر کی تقریظ تھی جو سر سید کی کتاب آثار الصنادید میں موجود ہے۔ اس میں (۱۰۷۲) شعر تھے پندرہ سال بعد ۱۲۷۱ھ میں سات سو شعر کے اضافے سے" (۱۷۹۲) اشعار پر مشتمل دوسرا ایڈیشن شائع ہوا جس میں پہلے مرزا کا فارسی دیباچہ پھر قطعات پھر ایک مثنوی، پھر قصیدے، رباعیات اور غزلیں آخر میں نیر

کی تقریظ۔ غالب کی زندگی میں اردو کلام کے چار ایڈیشن شائع ہوئے اس کے بعد تو بیسوں لیکن بھوپال کا نسخہ حمیدیہ اور غالب نامہ کا تاریخ وار مرتبہ کلام قابلِ ذکر ہے جس کے مطالعہ سے غالب کے مطالعہ کے متعلق معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ رامپور کے کتب خانہ میں بھی ایک دیوان غالب موجود ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ خود مرزا نے نواب کلب علی خاں کی فرمائش پر ۱۸۶۶ء میں اپنے کلام سے منتخب کیا تھا۔ باقی باتصویر نسخے برلن کے چھپے ہوئے مرقع چغتائی ہیں جن کی نفیس پاکیزہ اشاعتوں سے غالب کی قبولیت میں خاصا اضافہ ہوا۔ اور اردو زبان کی وقعت لوگوں کی نظروں میں زیادہ ہوئی۔

اُردو نثر

مرزا غالب فارسی شاعری کی طرح فارسی نثر کو بھی اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے۔ اردو نثر کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ سب سے پہلے انہوں نے اردو میں جو لکھا وہ ان کے خطوط تھے۔ مرزا کی عادت تصنیف و تالیف میں نہایت کاوش کی تھی جو طبعِ غیور کے سبب ہوئی کہ کہیں نسبتِ الزام نہ آجائے جب اس کاوش کی برداشت نہ رہی تو اُردو میں خط لکھنے شروع کئے یہاں مادری زبان نے اپنے گل کھلائے اور اپنے بیساختہ پن کے وہ رنگ دکھائے کہ جہانِ اُردو اور خیابانِ اُردو چمن چمن ہے

۱۸۵۰ء سے پہلے ہی انہوں نے فارسی میں لکھنا چھوڑ دیا تھا حالی نے اس کی وجہ مہرِ نیم روز کی تصنیف بتائی ہے لیکن حقیقت وہی ہے کہ

اب غالب سے تکلیف پُر تکلف برداشت نہ ہوتی تھی تو قلم برداشتہ اپنی مادری زبان میں اردو خطوط جس بے تکلفی اور شگفتگی سے لکھے وہ ان کی یادگاروں کے خاتم پر نگین بنکر چمکے۔

نامۂ غالب

غالب کو اردو نثر لکھنے کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب ان کی فارسی کتاب "قاطع برہان" کی تردید میں متعدد کتابیں فارسی، اُردو میں لکھی جانے لگیں۔ امام بخش صہبائی کے شاگرد مرزا رحیم بیگ میرٹھی نے ساطع برہان ۱۲۸۳ھ میں شائع کی تو مرزا نے اس کے جواب میں نامۂ غالب لکھا یہ ۱۶ صفحوں کا اُردو رسالہ ہے۔ اور اب عودِ ہندی میں شامل ہے۔

لطائفِ غیبی اور سوالاتِ عبدالکریم

قاطع برہان کی مخالفت میں محرقِ قاطع لکھی گئی۔ سید سعادت علی نے لکھی جو ۱۸۶۴ء میں مطبع دلہائی شاہدرہ میں چھپی اس کے جواب میں مرزا نے دو کتابیں لطائفِ غیبی، سوالاتِ عبدالکریم لکھیں ان دونوں کو اپنے دوستوں کے نام سے چھپوایا۔

لطائفِ غیبی:۔ ۳۴ صفحہ کا رسالہ ہے جس میں مرزا نے مخالفین کے جواب دیئے ہیں اور سیف الحق میاں داد خاں سیّاح کے نام سے ۱۸۶۵ء میں شائع کیا۔

سوالاتِ عبدالکریم۔ یہ آٹھ صفحوں کا مختصر رسالہ ہے غالب نے عبدالکریم کے

نام سے کل سترہ سوال لکھے ہیں ۱۲۸۱ھ میں اکمل المطابع دہلی میں چھپا۔

ساطع برہان، اور محرق قاطع کے علاوہ اور دو کتابیں قاطع القاطع
رتیغ تیز:۔ اور موید البرہان بھی مرزا کی مخالفت میں لکھی گئی تھیں جن کے جواب میں
مرزا نے سترہ فصلوں میں تیغ تیز لکھی پہلی سولہ فصلوں میں مؤید البرہان کے مؤلف
پر اعتراضات کئے ہیں۔ آخری فصل میں برہان قاطع پر مزید اعتراضات لکھے
آخر میں سولہ ادبی سوالوں کا استفسار اور ان کے جواب اور جوابوں کی
تصدیق و تائید درج ہے۔ جواب نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے لکھا
جس کی تصدیق حالی، مولوی سعادت علی اور نواب ضیاءالدین احمد
خاں نے کی ہے۔ یہ رسالہ ۱۸۶۷ء میں چھپا۔

نکاتِ غالب

اسی سال فروری کے مہینے میں مرزا غالب کا ایک اور اردو رسالہ نکاتِ غالب
شائع ہوا جس میں فارسی زبان کے قواعد لکھے اس کے دوسرے حصے میں
اپنے پندرہ فارسی مکتوب درج کئے جس کا نام رقعاتِ غالب رکھا یہ دونوں
۶۳ صفحوں پر مشتمل ہیں۔ وجۂ تصنیف یہ ہوئی کہ مرزا کے ہندو معتقد رائے
بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب۔ پنجاب کے ناظم محکمۂ تعلیمات میجر فل کی
دعوت پر لاہور گئے تاکہ علوم شرقیہ کی ترقی میں میجر فل کو مدد دیں کہ میجر نے
ان کو حکم دیا کہ مرزا سے بھی کوئی کتاب لکھوانا چاہئے جس کی بنا پر نکاتِ
غالب وجود میں آئی اور مطبع سراجی سے ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی اب

کمیاب ہے۔

قادر نامہ

زین العابدین خاں عارف۔ باقر علی خاں حسین علی خاں (بیوی کے بھانجے اور ان کے دو صاحبزادے) مرزا غالب ہی کے زیر پرورش تھے ان کی تعلیم کے لئے مرزا نے خالق باری اور آمد نامہ کے طرز پر ایک سو ستائیس شعروں میں اردو اور فارسی لغات کو منظوم کیا۔ درمیان میں دو غزلیں اور آخر میں چار شعروں کا ایک قطعہ بھی شامل کیا یہ آٹھ صفحوں کا مختصر رسالہ پہلی بار ۱۸۷۳ء میں منشی مداری لال کے مطبع میں چھپا اس کے بعد اس کے اور متعدد ایڈیشن چھپے۔

عود ہندی

غالب نے اپنی وفات سے کافی پہلے اپنے طرز کی اردو میں خطوط نویسی شروع کر دی تھی۔ جسے حلقۂ احباب میں خاصی شہرت حاصل تھی۔ وفات سے سات سال قبل ان کے جمع اور شائع کرنے کا خیال احباب کو پیدا ہوا۔ غالب ابتدا میں راضی نہ تھے۔ منشی شیو نرائن کو یہ کہکر ٹال دیا ان کا چھپنا میرے خلاف طبع ہے۔ ممتاز علی میرٹھی نے عملی قدم اٹھایا اور چودھری عبدالغفور سرور شاہِ عالم۔ صاحب عالم صاحبان کے نام کے اکتیس خطوط ۱۸۶۱ء میں جمع کر لئے جن پر سرور نے ایک دیباچہ اور قطعۂ تاریخ بھی لکھدیا بعد کو ممتاز علی خاں کو خیال آیا کہ اور خطوط بھی جمع کئے جائیں۔ چنانچہ خواجہ غلام غوث خاں

بیخبر کی مدد سے ایک سو سینتیس (۱۳۷) اور جمع ہوئے ان کے علاوہ تقریظیں اور نثر کے دوسرے نمونے بھی حاصل ہوئے ۔ اس پانچ سال میں مسودہ مکمل کر کے عود ہندی نام رکھا ۱۸۶۶ء میں مطبع مجتبائی میرٹھ میں چھپنے دیا۔ چھپتے چھپتے دو سال لگے ۱۸۶۸ء ۱۹ اکتوبر کو جب شائع ہوئی تو مرزا غالب کا ورقِ حیات شجرِ طوبیٰ سے زرد ہوکر جھڑنے والا تھا۔ صرف چار ماہ کی دیر تھی، یہ کتاب زندگی ہی میں چار رچد... پہلے چھپ چکی تھی۔

اُردوئے معلیٰ

ممتاز علی خاں کی تحریک کا جب غالب کے دوستوں اور شاگردوں کو علم ہوا تو ان کے خطوط کی اشاعت کے لئے مرزا پر تقاضے کرنے لگے مرزا میں بھی ان تقاضوں سے امنگ پیدا ہوئی اور وہ بھی مرسلہ خطوط واپس منگانے کی کوشش میں ہو گئے ۔ ممتاز علی خاں جب خطوط جلدی نہ چھاپ سکے تو مرزا کچھ بدگمان سے ہوکر خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کو لکھتے ہیں :-

اجی حضرت یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں رقعے جمع کئے اور چھپوائے نہیں فی الحال پنجاب کے احاطے میں ان کی بڑی خواہش ہے ۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ ان کو کہیں ۔ مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں وہ سب یا

ان سب کی نقل بطریقۂ پارسل آپ مجھ کو بھیج دیں۔ جی یوں
چاہتا ہے کہ اس کا جواب وہی پارسل ہو۔"

اس سلسلے میں مرزا کے شاگرد منشی جواہر سنگھ جوہر نے میر فخر الدین مہتمم اکمل المطابع کے ساتھ مل کر مرزا کے خطوط جمع کرنے شروع کئے۔ لیکن مرزا کی یہ خواہش ان کے جیتے جی پوری نہ ہوئی کیونکہ یہ مجموعۂ اردوئے معلیٰ ان کی وفات کے بیس دن بعد مارچ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا تو گویا اُردوئے معلیٰ میں وہ خطوط ہیں جو منشی جواہر سنگھ جوہر اور میر فخر الدین کی مشترکہ مساعی سے فراہم ہو کر "اُردوئے معلیٰ" کے نام سے موسوم ہیں اور جو مرزا کی وفات کے بیس دن بعد زیور طبع سے آراستہ ہوئے ہیں۔

یہ کہنا فہم نارسا اور محدود کوشش کی نہایت ہی سعی ناشکور ہوگی کہ یہ تصور کر لیا جائے کہ بس غالب کے اتنے ہی خطوط تھے جبکہ غالب ایک کثیر الاحباب ہستی تھے جنکا مشغلۂ حیات ہی یہ تھا کہ وہ صبح سے شام تک لوگوں کی غزلیں بنائیں متعلقین کے خطوط کا اسی روز جواب دیں۔ حد درجہ تاخیر ہوئی تو دوسرے روز جیسا کہ وہ کسی دوست کو خط لکھتے ہوئے اپنے عذر تاخیر میں ظرافت کا یوں اظہار فرماتے ہیں:۔

"بھئی آپ کا خط ۳۱ر دسمبر سن فلاں کو پہنچا
اور میں نے اس کا جواب دوسرے سال میں دیا۔"

حالانکہ جواب غالب نے یکم جنوری کو دیا ہے یہ گو دوسری صبح ہی میں

جواب دیا ہے مگر اپنی فطری ظرافت اور شوخی طبع سے دوسرے سال میں ایک سال پیچھے بتاتے ہیں جو سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی نہیں۔

حقیقت یہ تھی کہ خط شام کو آیا اور صبح کو اس کا جواب دیا۔ بس یہی چیزیں ہیں جو غالب بار بار ذہن میں گذارتے رہتے ہیں دشمن بھی اپنے اعماقِ قلب میں جن کے لئے جگہ پاتے ہیں۔

غالب کے خطوط کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ حالانکہ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے تحقیقی مضامین کے ساتھ کچھ چھاپے ہیں اور پروفیسر مہیش پرشاد بنارس یونی ورسٹی غالب کے متعلق خاصے انوکھے معلومات رکھتے ہیں۔ اور مالک رام، جن کو مالک رام غالب ہی کہتے ہیں، جو آج کے جشنِ صد سالہ کے ارکانِ خصوصی کے بھی ممبر ہیں۔ وہ بھی غالب کے متعلق بہت سی نادرات کے یہ مالک رام مالک ہیں۔

رام پور کے دارالانشا میں جو خطوط محفوظ تھے وہ بھی چھپ چکے ہیں جن کی تعداد ۱۱۵ ہے اور اس اجتماعی اور انفرادی کوشش کے باوجود حسن اتفاق کے طور پر بھی کبھی کوئی غیر مطبوعہ خط غالب کا منصۂ شہود پر آ ہی جاتا ہے۔

اب جبکہ حکومت کی طرف سے اس کی سرپرستی میں غالب کی صد سالہ سنچری پر بہت کچھ اجتماعی مساعی پر کام ہو رہا ہے امید ہے کہ بہت سے گوشے جو اب تک نا آشنا رہے ہوں خدا چاہے ضرور اُجاگر ہوں گے۔ ہماری یہ "سیر غالب" بھی گو یہ ایک

انفرادی ورک ہے۔ مگر خلوص دیرینہ کی حامل ہے۔ اور ایک اساتذہ کی جماعت کے لئے یہ ترتیب دی گئی تھی جو اس خصوصی موقف میں منظر عام پر آرہی ہے۔

اور بکثرت اپنے آغوش میں ایسے خصوصی کردار لئے ہوئے ہے جن سے موجودہ اردو لٹریچر ایک حد تک متعارف نہیں ہے۔ غرضیکہ خلاصہ غالب کے ادبی کارناموں کا یہ ہے:۔

فارسی نظم

کلیات ۔ ابر گہر بار ۔ سبد چین

فارسی نثر

پنج آہنگ ۔ مہر نیم روز ۔ دستنبو ۔ کلیات نثر
قاطع برہان ۔ درفش کاویانی ۔

اردو نظم

دیوان غالب ۔ مثنوی صفت انبہ ۔ مثنوی صفت پتنگ ۔ قصائد ۔ قطعات ۔ رباعیات ۔ سہرے ۔

اردو نثر :۔ نامۂ غالب ۔ لطائف غیبی ۔ سوالات عبدالکریم
تیغ تیز ۔ نکات غالب ۔ قادر نامہ ۔ عود ہندی

اُردوے معلی ۔ مکاتیب غالب۔

ملاحظہ ہو کہ بعد کی دو چیزیں یعنی اُردوے معلی ۔ اور مکاتیب غالب ، غالب کی زندگی میں نہیں چھپیں۔

الحاصل! آج اردو ادب اپنی ہر دو نظم و نثر میں غالب کا ممنون احسان ہے اور یہ غالب علی کل غالب کا "سِرِ غالب" میں ایک رسمی تعارف تھا۔ جسکا روح غالب نے افتتاح کرایا ہے اور ہمیں اس خالص ادبی تحریک کا خیر مقدم ضروری ہے جبکہ ہماری زبان کو اس نے خصوصی لگاؤ ہے مگر اسی پر قناعت ہمارے نزدیک ادبی کفران ہے ہمارے ادبی تمدن کے چمنستان بہار میں رنگ برنگ کے پھولوں نے اپنی مہک لہک سے مشام جان ملک و ملت کو معطر و معنبر کیا ہے۔ اب ہم "اہم معلومات" کے زیرِ عنوان کچھ خصوصی حقائق ہدیۂ ناظرین کرتے ہوئے اہل ادب کی توجہ اس خصوص پر ملتفت کرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ قوم میں یہ پرستش غالب کی بیوقتہ راگنی اپنی بلکہ لاکھ داعیت کی حامل ہو مگر ہے یہ ایک معمہ ہی جبتک اسکا کھل کر کوئی حقیقی پس منظر سامنے نہ آئے ورنہ پھر ہم اپنی اس خوش بختی پر جس قدر بھی ناز کریں کم ہے کہ ہزاروں احساس کمتری کے باوجود صد شکر کہ ہمارے ادبی احساسات مردہ نہیں اور غالب ، غالب ہی رہے یہ بھی کوئی امر مستبعد نہیں ؎

"قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص"

۵- اہم معلومات!

غالبؔ کا ادبی مقام :- زمانہ کا ایک زمانے سے یہی دستور چلا آرہا ہے کہ لوگ بولنے سے پہلے گُن گُنا سیکھ لیتے ہیں۔ عرب جاہل محض تھے۔ لیکن مشاعروں کے میدان میں دنیا ان کے سامنے عجم، گونگی تھی۔ زمانہ اسلام تک عرب بحیثیت شعر گوئی کے زمانے سے روشناس تھا۔ اسلام آیا قرآن کی ترسیل و خطابت کی معجز نمائی نے عربوں کی قوت شعر گوئی کو فنِ خطابت میں ڈھال دیا۔ جسکے سبب اعلیٰ درجہ کے لیکچرار، خطیب عرب میں بروئے کار آئے یہی حال اُردو کا بھی ہے کہ اس نے بھی شگفتہ نثر سے پہلے نظم میں جنم لیا ہے۔ امیر خسروؒ کا زمانہ جو تقریباً ۷ سو سال پیشتر کا تمدن پیش کرتا ہے ملک میں اسوقت کی بھاشا ہندی کی بہت کا بول بالا تھا۔ امیر خسروؒ ابتدائی تعلیمی رسالہ کا نام "خالق باری" رکھتے ہیں جسکا پہلا شعر یہ ہے :-

خالق باری سرجن ہار ؎ واحد ایک، بدا کرتار

تو یہی جیسے دورِ تغلق تک اور کچھ منجھی اور جب دکن پہنچی تو ہندی کے سرمایہ پر اس نے نظم کی صورت اختیار کرلی۔ اس لئے کہ دکن میں یہ تغلق برادر [illegible] ناصر وریات زندگی، بول چال کو مقامی پراکرت سے مدد لے کر اسی نیم پختہ اردو میں پیرا کر لیتے سیاسی خلیج حائل ہونے کے سبب فارسی سے بایکاٹ تھا کہ دکن کے دہلی سے روابط نہ رہ سکیں۔ یہ نیم پختہ اردو دہلی اور اُسکے اردگرد کی جو امیر خسروؒ کے زمانے سے بتدریج مدارجِ ارتقا طے کرتی آرہی تھی عہدِ تغلق اسے دہلی سے اپنے ساتھ دکن لایا

کہ اُسوقت اُسکی اور اُسکی فوج کی اور دہلی والوں کی یہی بولی تھی، محفلِ شعر و سخن کے
لئے دہلی مرکز میں فارسی تھی جو اُن دنوں دکن میں سیاسی وجوہ پر معتوب تھی تو اسی
ٹوٹی پھوٹی اردو سے اپنی وجدانی مناسبت اور فطری لگاؤ کو توڑ نہ سکتا تھا۔ دکن اسی کو
بصورتِ شعر ادا کرنے لگا جسکا زیادہ تر حصہ مرثیوں کی شکل میں تھا کہ حکومت پر عادل
شاہی غلبہ شیعیت کا تھا۔ اور محرم ہی کی مجالس عزا شاعری کے لئے تہییج اور تحریک
تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ولی کے دہلی پہنچنے کے وقت دہلی والوں کا تعجب سے یہ کہنا کہ "کیا ریختہ
میں بھی شعر کہے جا سکتے ہیں"۔ اس کا مطلب یہ تو کسی صورت نہیں ہو سکتا کہ اردو زبان
کی ابتدا اور جائے پیدائش دکن ہے چنانچہ خود یہ استعجابی جملہ جو دہلی والے بولے بہت
سلجھی ہوئی اردو میں ہے جو اسوقت وہ بولتے تھے اور دکن اتنی فصیح نہ بولتا تھا
اُردو تو شمالی ہند ہی کی پیداوار ہے۔ دکن کو یہ فخر البتہ ضرور ہے کہ وہاں شمال سے
بہت پہلے اردو شاعری وجود میں آئی وہ مرثیے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ نیم پختہ اُردو
وہاں شاعری کی بھی زبان تھی اور بولی بھی تھی۔ جو مقامی دکنی پراکرتوں کے دباؤ
میں صاف تو کیا ہوتی بلکہ اُنکی آمیزش پر ایک مخلوط شی ضرور تھی مگر کہلاتی اُردو
ہی تھی دو سو سال بعد دہلی کی زبان کافی منجھ گئی تھی۔ ولی کی دیکھا دیکھی شمال
میں بھی دکن سے عمدہ اردو میں شاعری ہونے لگی افسوس کہ اردو کے نقادوں نے
اس رُخ سے کوئی ادبی نقاب نہیں اٹھایا اور غلط طریقہ کار پر پنجاب میں اُردو
دکن میں اُردو رسہ کشی کرتے رہے۔ دکن کا ہسٹاریکل فخر یہ کیا کم ہے کہ اُس نے
تاریخ ارتقائے زبان میں وہ اہم رول ادا کیا ہے کہ ہند میں یہ سہرا نہ پنجاب کو
میسر آیا نہ بنگال کو ہر دو جگہ بھی دکن کی طرح اُردو گئی مگر وہاں کی بولی نہیں بنی
پنجابی بنگالی کے ساتھ علمی کتابی زبان رہی اور دکن میں یہ بولی "کہلائی نثر و نظم
کی زبان اسکو کہا گیا کہ یہ دکنی جو بولتے تھے وہی لکھتے تھے اور آج بھی وہی بولتے ہیں

اور وہی لکھتے ہیں اسی میں شاعری کرتے تھے کہ اُنکے پاس یہی سرکاری زبان تھی اور یہی ملکی۔ اس حقیقت مآب نظریے کی وضاحت ہم نے اپنی کتاب "ناگزیر اردو" میں لائل پیش کی ہے۔ غرضکہ اردو بولی اپنے منازل ارتقا طے کرتی رہی حتیٰ کہ دورِ غالب میں یہ بحدِ کمال عروج پر تھی۔ چنانچہ غالب کے زمانہ سے کچھ ہی پہلے سوداؔ کی اردو نثر ملاحظہ ہو۔ "ضمیر منیر پُر آئینہ دارانِ معنی کے مبرہن ہو" اور اس کے بالمقابل غالب کی کانِ جواہر بولی لائی جائے۔ ع چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک، اسکے باوجود گنجلک مقفیٰ مسجع عبارت آرائی کا رواج فی الجملہ اُردو کی بساط پر بھاری ہی تھی مگر تقاضہ و رجحان کو غالب نے اپنی اردو خطوط نویسی سے ایسا ہلکا پھلکا بنا دیا کہ زبان کی عام فہم سہولت، عالمگیر افادیت بن گئی۔ اگرچہ ابتدائی شاعری پر فارسی کا غلبہ غالب کے یہاں بھی ہے جو طرز بیدل میں تھی اور تلف کر دی گئی جسکے کچھ اشعار اتفاقِ وقت سے اردو دیوان میں موجود رہ گئے ہیں مثلاً "سر گشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا" اور ع شمار سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا۔ لوگ مسجع عبارت کے شیدائی تھے تو جو حالت لوگوں کی بولی کی تھی وہی حالت غالب کی اردو شاعری کی تھی جو مغلق بھی تھی اور عسیر الفہم بھی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ غالب ہیں جنہوں نے لاشعوری اور غیر ارادی طور پر اپنے سہل ممتنع نظم و نثر سے اردو ادب پر وہ احسانات کئے ہیں جن کا خاکہ سیرِ غالب کے مختلف عنوانوں میں آپکے سامنے آرہا ہے کہ اسی اغلاق پسند شخصیت نے اِدھر آپکی بولی کو ملکوتی بنایا تو اُدھر آپکی شاعری کو بھی وہ بقائے دوام کی مسیحائی بخشی کہ دنیا محوِ حیرت ہے یہ فیصلہ ہمارا ہی نہیں بلکہ ہر ذی شعور یہی سمجھتا ہے کہ حسن بقا کا سہرا اردو شاعری و اردو نویسی میں غالب کے سر ہے۔ کہتے ہیں کہ اردو نثر نگاری کی کایا پلٹ سرسید کی طرزِ تحریر سے ہوئی لیکن اسکا سبب بھی یہی ہے کہ غالب کی اردو خطوط نویسی نے

یہ ادبی مذاق پیدا کیا تھا آج کا پورا اُردو سنسار غالب کے ادبی احسانات کو ہر ہر رُخ سے پیش کر رہا ہے۔ اگرچہ غالب کی اس انقلابی کایا پلٹ اصلاح کے بعد بھی سودا کی نثر کے نمونے آج بھی ملتے ہیں۔ کہ وہ علمی ماحول جو اپنے پرانے طرز پر گامزن ہیں وہاں وہی عربی فارسی کی مخلوط ترکیبوں کا سنگم رہتا ہے مگر خوشگوار قدروں تر اور جہاں دینی علوم کا گہرا تمدن ہے وہاں تو عربی جملوں تک کا استعمال ہے مگر اسے "بولی" نہیں کہا جاتا۔ "بولی" تو وہی ہے جو عوام کی زبان پر بول بولے جائیں۔ اس خصوص میں غالب کا اُردو ادب میں جو مقام ہے اُردو کے نظم و نثر اسکے لئے شاہد عدل ہیں۔

نیز غالب اپنی فارسی دانی کے سبب ایران کے دور متاخرین کے اساتذہ کے ہم پلّہ ہیں۔ اگر استادِ ظفر ذوق کو خاقانیِ ہند کا خطاب اک حسنِ اتفاق پر مل گیا تھا تو خود ملک الشعراء خاقانی کی اتباع بلکہ ہمنوائی کا جذبہ، جذبہ ہی نہیں بلکہ سکت صلاحیت اصل خاقانی سے کہیں زیادہ غالب میں بدرجۂ اتم موجود ہے اور اس بیدل کے اس مصرعہ کا مصداق ع "اہل زباں سے بڑھکے زباندانِ اجل ہے" فارسی دانی میں غالب سے بڑھ کر اور کون ہوگا۔ بڑھ کر نہ سہی مگر ہم پلّہ ہونے میں تو کوئی استبعاد نہیں۔ الحاصل ! غالب کا مقام اردو فارسی میں ادبی حیثیت سے اُستاذ الاساتذہ کا ہے بالخصوص اردو نثر نگاری میں تو غالب اک امام الادب اور بابائے ادب اُردو ہیں جن کے خطوط کو ادبی خطوط کا نام دیا گیا ہے اور وہ ہیں بھی ویسے ہی یعنی سراپائے ادب جن میں کتر بیونت کا نٹ چھانٹ نام کو نہیں۔ اوّل سے آخر تک پورے جہانِ ادب کائنات ادب ہیں۔

غالب کا اُردو کلام چونکہ انسانی جذبہ محاکات کی مکمل تصویر ہے۔ اسلئے غالب کا ہر شعر ہر مصرعہ اور ہر جملہ ادائے جذبات کا آئینہ ہے۔ بالخصوص جب

علامہ ذوق کے بالمقابل لایا جائے تو اس کا فرق بیّن طور پر واضح ہے کہ استاد ذوق کے کئی کئی شعر ملکر غالب کے ایک شعر کے مضمون کو پورا کرتے ہیں اور رہا حسنِ بیان حسنِ ادا کا ذوق تو وہ ذوق کے یہاں پھر بھی کم ذوق ہے مثلاً ایک شعر غالب کا ملاحظہ ہو۔

ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا ؛ کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے

یہ اس سہرے کا شعر ہے جو اس دربار میں پڑھا گیا جہاں کے استاد شہ ذوق ہیں اس ایک شعر کے مضمون کو استاد شہ ذوق نے تین شعروں میں ادا کیا پھر بھی زیور کا قافیہ نہ بندھ سکا۔ ذوق کے بالمقابل اشعار ملاحظہ ہوں:۔

دیکھ مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا ؛ وہ کہے صلِّ علیٰ، یہ کہے سبحان اللہ
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو منہ پر سہرا ؛ سر پہ طرہ ہے مزیّن تو گلے میں بدھی
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا ؛ ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش

ذوق کے ان تین شعروں کو ملاحظہ فرمائیں۔ پھر ان کے مقابلہ پر غالب کا بھی مذکورہ بالا شعر پھر پڑھیے تو علامہ ذوق کی تہی دامنی کی بیاض کھلی کی کھلی رہ جائے ایسا معلوم ہو کہ محفلِ عقد میں ذوق دھنّا کہہ رہے ہیں یا پھر جہیز کی فہرست پڑھ رہے ہیں نہ کہ سہرے کے اشعار۔ اور ستم ظرفی کہ زیور کو پھر بھی سنانا بھول گئے ہیں جو جہیز کا اصل سرمایہ ہے۔ **الغرض الحاصل!** غالب نے ہر دو نظم و نثر میں اردو ہو کہ فارسی ایسے نادرات ادبی شہ پارے بطور وراثت ہمارے لئے چھوڑے ہیں کہ ہم ان کی اقتداء میں جسقدر گامزن ہوں کچھ نہ کچھ پھل پائیں جسکے لئے آج کا تمدن اور ادب غالب کے حق میں رطب اللسان ہے۔

غالب کا طرزِ تحریر

غالب کا طرز بھی قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی ہی تھا اور اس بارے میں اُن کو معذور سمجھنا چاہیئے کہ اس زمانے میں یہی طرز مقبول اور پسند تھی۔ کتابوں پر تبصرے اور دیباچے بھی

آپ نے اسی طرز میں لکھے ہیں کہ فرمائش کرنے والے اسی سے خوش ہوتے تھے۔ البتہ اس طرز میں بھی غالب نے اپنی مخصوص جدت طرازی کو نہیں چھوڑا۔ آپ نے مطالب اور معانی کے سمندر بہا دیئے ہیں۔ جہاں بھی تصوف پر قلم اٹھا ہے تصوف کے نازک اور لطیف نکات اور بلند خیالات قلمبند کر دیئے ہیں۔

اردو نثر میں غالب کی اہمیت اور اولیت انکے رقعات و خطوط کی بنا پر ہے آپ نے سب سے اول اردو میں سادہ اور شیریں نثر لکھی۔ اور خطوط نویسی کا ایک عجیب طریقہ ایجاد کیا اس تعلق سے اور اس حیثیت سے غالب اول بھی ہیں اور آخر بھی، موجد بھی اور خاتم بھی۔ کہتے ہیں کہ آپ ۱۸۵۰ء تک فارسی میں عادتاً خط لکھتے تھے جب بہادر شاہ نے آپ کو تاریخ نویسی پر مامور کیا تو محنت سے بچنے کے خیال سے اردو میں بھی خط و کتابت شروع کی کیونکہ تاریخ نویسی کے ساتھ ساتھ فارسی خطوط نویسی پر بھی دماغ پاشی مشکل تھی مگر جوں توں یہ سلسلہ فارسی خط نویسی کا کسی نہ کسی حد تک باقی تھا جب غدر کے بعد مصیبتوں نے آپ کو بالکل ہی مضمحل کر ڈالا اور اس قابل ہی نہ رکھا تو آپ نے عزم کر لیا کہ اردو ہی میں خط لکھا کریں گے۔ تاہم کبھی کبھی خاص خاص موقعوں پر یا شگفتگی مزاج کے لیئے یا فتِ فرصت پر فارسی میں بھی خط لکھ لیا کرتے تھے۔

غالب کے خطوط جواب تک ملے ہیں تین چار مجموعوں میں شایع ہو چکے ہیں۔ ضخامت قریباً نو سو صفحات کی ہے۔ اور خطوط جملہ آٹھ سو چھبیس، سات سو چھبیس خطوط ادبی حیثیت کے مالک ہیں۔ غالب نے جن کو اپنے طرز خاص میں لکھا ہے اِن میں انکی خاص شوخی، ظرافت، ادبی نکات، علمی مباحث اور اشعار کی تشریح یا شاگردوں کے کلام پر اصلاح موجود ہے۔ اسلئے غالب کے خطوط کو بھی تصنیف ہی کا درجہ دیا جانا چاہیئے۔ غالب اِسی صنفِ ادب کی بدولت، "صاحب طرز" مانے جاتے ہیں۔ غالب کی خطوط نویسی کی خصوصیات یہ ہیں:- القاب و آداب،

مزاج پرسی اور خیریت نگاری کے پرانے طریقہ آپ نے بالکل چھوڑ دیئے تھے۔ نئے نئے القاب لکھتے، لیکن مختصر اور موزوں جیسے میاں، برخوردار۔ بندہ پرور، مہاراج پیرو مرشد۔ بھائی صاحب۔ کبھی کبھی مقفیٰ الفاظ بھی لکھا کرتے تھے مگر اسی ندرت کیساتھ جیسے "میری جان کے چین میاں سرفراز حسین"۔ کبھی کبھی القاب کے بغیر ہی خط شروع کر دیتے تھے۔ اسی طرح مزاج پرسی کے بھی نئے نئے طریق نکالے تھے جیسے جیتے رہو، خوش رہو۔ آخر میں اپنا نام بھی اسی طرح لکھا کرتے اور تاریخ بھی ایسے ہی جیسے "جواب کا طالب غالب" اور ۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کی بدھ کا دن صبح کے آٹھ بجا چاہتے ہیں"۔ کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانتے ہونگے"۔

غالب خط کو مکالمہ بنا دیتے ہیں، اسطرح لکھتے ہیں کہ گویا آمنے سامنے بیٹھ کر باتیں کر رہے ہیں۔ خود غالب نے اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے کہ "میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے"۔ جیسے "محمد علی بیگ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ حضرت ابھی نہیں، کیا آج نہ جائیں گی؟ آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے"۔

اس طرز مکالمہ میں بھی مخاطب کو خطاب کرتے ہوئے غالب، غائب فرض کر لیتے چنانچہ اگر کسی کو اس طرز تحریر سے واقفیت نہ ہو تو وہ اسے مخاطب نہیں بلکہ ایک تیسرا شخص سمجھ لے گا۔ یہ جوہر علم ادب کا ایک خاص ملکہ کہلاتا ہے جو عین فصاحت، بلاغت کی جان ہے۔ اور علم معانی میں اسے التفات کہتے ہیں۔

حالی نے "یادگار غالب" میں غالب کی نامہ نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ "ان کی خداداد شوخی اُن کے خطوط کو ناول اور ڈرامہ سے زیادہ پُر لطف بنا دیتی ہے۔ مکتوب الیہ جس درجہ اور رتبہ کا ہوتا ہے اُسی درجے اور مرتبہ کی ظرافت اور شوخی خط میں دکھاتے ہیں یہ بات اکتساب یا مشق سے حاصل نہیں ہوتی، مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے اور اُس میں اُن کی لڑکی کو جو بچپن میں مرزا کے سامنے

آتی تھی اور اب جوان ہوگئی ہے لکھتے ہیں۔ "وہ کیوں بھئی اب ہم اگر وہاں آئیں بھی تو تم کو کیونکر دیکھیں گے کہ تمھارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں"
کبھی کبھی اسی پیرایۂ ظرافت سے حسن طلب کا کام لیتے ہیں اور کبھی کسی فرمائش کو ہنسی ہنسی میں ٹال دیتے ہیں، مثلاً ایک بار ایک نواب صاحب نے اپنے لڑکے کی تاریخ ولادت اور تاریخی نام کی فرمائش کی اور آپ ایسے نام اور تاریخیں نکالنے کے لئے ہمیشہ گھبراتے چنانچہ اس فرمائش کے جواب میں لکھتے ہیں:۔
"شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے اور طریق صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں، تم سخنور ہو گئے، حسن طبع خداداد رکھتے ہو، ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ نکالو کہ مجھ پیر غمزدہ دل مردہ کو تکلیف دو، علاؤ الدین احمد خان! تیری جان کی قسم میں نے پہلے لڑکے کا جو اس میں تاریخی نام نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ وہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی میرا ممدوح جیتا نہیں، نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیئے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے پھر نہ سنبھل سکے جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے پرے پہنچا، نا صاحب دہائی خدا کی نہ تاریخ ولادت کہوں نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔"
غالب اپنے خطوط میں ظرافت کے نئے نئے پیرائے پیدا کرتے ہیں مفلسی میں کپڑے بیچنے پڑے تو لکھتے ہیں "اور لوگ روٹی کھاتے ہیں میں کپڑا کھاتا ہوں"
بعض خطوط میں شروع سے آخر تک مقفیٰ عبارت لکھتے ہیں۔ بعض مقامات پر الفاظ کی ترتیب جملے میں قدیم طرز کی ہوتی ہے۔ بعض مقامات پر فارسی محاوروں کا لفظی ترجمہ کر دیتے ہیں۔ جیسے بہم مارنا، بہم زدن کا ترجمہ ہے۔ نیز امثلۂ ذیل ملاحظہ ہوں۔ جو غالب کی طرز تحریر کی اکثر خصوصیات کی حامل ہیں:۔

مراسلہ بطرز مکالمہ!

"میر مہدی جیتے رہو۔ آفریں صد ہزار آفریں اردو لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھے رشک آنے لگا ہے۔ سنو! دلی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب کے احاطے میں گئی ہے۔ یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت تھی۔ سو ایک ظالم پانی پت، انصاریوں کے محلہ کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اُسے بحل کیا۔ اللہ برکت دے۔"

حُسنِ طلب کی مثال

نواب رامپور کے نام لکھتے ہیں :۔

"حضرت ولی نعمت، آیۂ رحمت سلامت۔

بعد تسلیم معروض آنکہ منشور عطوفتِ مہربانی عزّ ورود لایا۔ تنخواہ کا روپیہ ازروئے ہنڈی ملفوفہ معرضِ وصول میں آیا۔ اگرچہ یہاں مینھ اسی قدر برسا ہے کہ جسکے پانی سے زمیندار حاصلِ فصلِ ربیع سے ہاتھ دھو بیٹھے،[عٰ] مگر چونکہ بفرمانِ ایزدی میرے رزق کی برات آپ پر ہے اور آپ کے ملک میں بارش خوب ہوئی ہے، ابرِ رحمت کے شکر یہ میں ایک قطعۂ ملفوف اسی عرضی کے بھیجتا ہوں بہ نظرِ اصلاح نظم و اصلاحِ حال ملاحظہ ہو۔ زیادہ حدِّ ادب۔

نجات کا طالب ، غالبؔ

تم سلامت رہو ہزار برس ؛ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعہ یہ ہے :۔

مقام شکر ہے اے ساکنانِ خطۂ خاک ؛ رہا ہے زور سے "ابرِ سیاہ بار برس"

کہاں ہے ساقیِ مہوش کہاں ہے ابرِ مطیر ؛ بہار لایئے گلنار گوں بیار برس

خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی ؛ درِ حضور پہ اے ابر بار بار برس

ہر ایک قطرہ کے ساتھ آئے جو ملک وہ کہے ؛ امیر کلب علی خاں جئیں ہزار برس

فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں ؛ کئی ہزار برس بلکہ بے شمار برس

عٰ یعنی اسقدر کم کہ صرف ہاتھ دھوئے جا سکتے ہیں اور دوسرے معنی یہ کہ کوئی گنجائش نہیں

شفا ہو آپ کو، غالب کو بندِ غم سے نجات
خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس"

مسجع مرقع کی مثال

ایک خط جسمیں غالب نے ہندوستان کے فضلاء پر نکتہ چینیاں کی ہیں اور اپنا علم و فضل جتانے کی کوشش کی ہے لکھتے ہیں :- "صاحب وہ خط جسمیں اشعار سید مظلوم کے تھے مجھ کو پہنچا اور میں نے اس خط کا جواب تم کو بھیجا اور ذکر اشعار قلم انداز کیا۔ فارسی کیا لکھوں یہاں ترکی تمام ہے، اخوان و احباب یا مقتول یا مفقود الخبر، ہزار آدمی کا ماتم دار ہوں۔ آپ غمزدہ اور آپ غمگسار ہوں اس سے قطع نظر کہ تباہ و خراب ہوں، مرنا سر پہ کھڑا ہے پا بہ رکاب ہوں۔

"طرح" بالفتحہ بمعنی نمونہ اور بمعنی فریب، لیکن "طرح" بفتحتین اور چیز ہے غیاث الدین رام پوری ایک ملائے مکتبی تھا لاعاقل، جسکا ماخذ اور مستند علیہ قتیل کا کلام (معدن الفوائد قتیل)، ہوگا اُسکا فرق لغت میں کیا فرجام ہوگا!" مصرعہ کیستم من کہ تا ابد بزیم؛ لاحول ولا قوۃ، یہ میرا مصرعہ نہیں ہے، یہ فارسی لالہ قتیل کی ہوگی۔ میرا قطعہ یہ ہے :-

"چوں نظیری نماند و طالب مرد | کیستم من کہ تا ابد باشم
مرد غالب، بگو کہ غالب مرد" | در بگو یند زر کدا ہیں سال

یہ مادہ تاریخ نجوم و کشف پر نہ تھا بلکہ صفائے قلب پر تھا، جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں کہ اسپر آٹھ سال کے اضافہ سے "آہ غالب بمرد" تاریخ وفات ہے جسمیں آہ کے چھ اور ب کے دو عدد بڑھے ہیں کہ غالب کی رحلت ۱۵ار فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲ر ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ کو ہوئی ہے۔ اور یہ ذہنی عصمت طفلی کے اطمینان بخش زمانے کے سمجھ لو۔۔۔ غالب نے اپنے خطوط میں اپنے شاگردوں کے

کلام پر اصلاح دی ہے اور یہ اصلاحیں شاعری کے اہم نکات کہلانے کی مستحق ہیں ۔ مختصر یہ کہ ان گوناگوں اور رنگارنگ جدتوں نے غالب کے خطوط میں بڑی دلکشی پیدا کر دی ہے ۔ اس طرز کے گویا آپ ہی موجد تھے اور یہ آپ پر ہی ختم ہوگئی ۔ تقلید کی کوشش کرنے والوں میں سے کوئی اس پایہ کو نہ پہنچا ۔ غالب کے خطوط سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ لوگ آسان اور سادہ نثر لکھنے لگے ۔ اور یہ احسان غالب کا اردو زبان و ادب پر لاثانی ناقابل فراموش ہے ۔

۳۔ غالب کا تعارف بحیثیت صاحبِ طرز

پچھلے عنوانوں کے تحت اس چیز پر روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ غالب ایک کثیر الاحباب شخص تھے اُن کے اپنے وقت کے عمائدین اُنکے حلقۂ احباب میں تھے ۔ چونکہ غالب "ہمہ اوست" اور "صلح کل" کے فلسفہ کے حامی اور حامل تھے ان کا کہنا ہے کہ ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اصل شہود و شاہد و مشہود ، ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

اسلئے بلا تفریقِ ملت ہر مذہب و ملت کا آدمی غالب سے راہ و رسم رکھنے کا متمنی رہا ۔ غالب اپنے دوستوں کو اپنے اندازِ بیان سے خوش رکھتے اور لطف اندوز کرتے ہیں قصداً یا طبعاً ایسے کوشاں نظر آتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید قدرت نے انھیں اسی دل جوئی کی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے ۔ اور اُسکے عوض جملہ مناسک شرعی نماز روزہ ، حج زکوٰۃ معاف کر دیئے چنانچہ اُنکے اس ادائے فرض کے ترجمان اشعار بانگِ دہل بتا رہے ہیں : ۔

حج ؎
اگر اس سفر میں مجھ کو جو ہمراہ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی !

گویا اس حج کے ادائے فرض یا حصول ثواب سے بڑھکر غالب کو رقابت مقصود تھی۔

روزہ ؎ جس کے پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

زکوٰۃ ؎ قرض کی پیتے تھے مے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نماز اور جملہ عبادات کے بارے میں بقول اقبال ع
"ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں"

غالب اس عقیدہ کے تھے :-

ستائش گر ہے زاہد اسقدر جس باغ رضواں کا ؎ وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

اور غالب کی ذہنی ارادت اور حقیقت عقیدت ملاحظہ ہو :-

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے ؎ مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

غالب چونکہ دستوری تعلیم سے حسن اتفاق کہ سوئے اتفاق سے بہرہ مند نہ ہو سکے اور اپنی ذاتی کاوش دماغی سے یا اُس خاندانی تربیت سے جس فریدونی پر غالب اور اُس کی فارسی دانی کو بڑا ناز تھا یا پھر اُس خاندانی ماحول کے اثرات پر

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری ؎ کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

غرضیکہ ان چیزوں کے نامعلوم اثرات کے تحت غالب ہمیشہ اپنی دماغی کاوش سے نت نئی جدتیں تراشتے کہ جس سے دوستوں کو کام و دہن کی لذت سوا حاصل ہو، دوست آپکے مکتوب کے انتظار میں بے تاب رہتے تھے محض اسوجہ سے کہ غالب پوری کوشش اور اپنی پڑوہی خاطر اس میں صرف کر ڈالتے کہ ان کا مکتوب الیہ انکے خط کو پڑھکر آنکھوں سے لگائے اور سرور قلبی حاصل کرے۔ غالب کی تمام نثری

تحریرات میں یہ چیز بے محابا بیباکی کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ اسکا یہ نتیجہ ہوا
کہ غالبؔ نے وہ فرسودہ رسمی تکلفات بیک قلم سر قلم کر دیئے جن میں آداب و القاب
کی بے سود بھرمار ہوتی اور خطوط کے اس حصّہ میں بھی غالبؔ نے مکتوب الیہ کے
وقتی جذبات کے پیش نظر احساسات میں دلجوئی کے الفاظ و افکار پیش کرنا
اپنا شعار بنا لیا جسکے سبب غالبؔ کے نثری کلام میں وہ شگفتگی پیدا ہو گئی کہ عمر
کا یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں اُلٹا سیدھا۔

غالبؔ کے مکتوب "من اوّلہ الی آخرہ" ایک بوستانِ خیال، خود کو
پیش کرتے ہیں۔ پڑھنے والے کا دل چاہتا ہے کہ بار بار پڑھے اور ان مرصع جواہر
نگینۂ الفاظ کو جو غالبؔ نے اپنی صناعی اور کہنہ مشقی سے خلوص و ارادت کی
عقیدتوں میں بٹھائے ہیں۔ اُن کی بہار جلوہ دیکھے۔ چند ہی روز میں غالبؔ کی نثر کے
طرز کا چرچا شہرۂ آفاق ہو گیا اور لوگوں کو کلام غالبؔ میں، غالبؔ کے بیساختہ پن سے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا ؛ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے تک
کا مزہ آنے لگا"۔ اس سے پہلے دو قسم کی تحریریں ہوتی تھیں ایک کتابی
ایک مکتوبی بلکہ ایک تیسری بول چال کی، غالبؔ نے ان کے امتزاج سے ایک
ایسی نئی محاکاتی سہ آتشہ تصویر کھینچی اور وہ شراب وحدت سبھوں کو پلائی
جس سے آج دنیا رطب اللسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہتوں نے اس کی تقلید کی جرأت
اقدام کی مگر عہدہ برآ نہ ہو سکے، غالبؔ ہی کے سر اسکا سہرۂ آفرینش رہا اور
اُسی کے ہاتھوں اسکا علم خاتم رہا۔ آج بھی دنیا خطوط غالبؔ پڑھ کر لذت
لیتی ہے جب تقلید و نقالی کی کوشش کرتی ہے تو باوجود سعی موفور اس نقش
میں بھی سعی نا مشکور سے دوچار ہے۔ اسلئے کہ غالبؔ کا حوصلہ غالب کہاں سے
لائے اور اس طرز میں ضرورت ہے کمال بے باکی اور اعلےٰ حوصلگی اور قوت ارادی کے

بلند استحکام کی یہ چیزیں غالب میں من وعن بدرجہ اتم موجود ہیں جو اوروں کو
کہاں میسر —؟

الغرض! غالب اپنے وقت کے ایک صاحب طرز نثر نگار تھے۔ اور
اردو شاعری انکا کوئی خاص طبعی مذاق اور وجدانی مشغلہ نہ تھا بلکہ وقتی تمدن کے
اثرات میں یہ کہ آپ اپنے خداداد ذہن رسا اور اپنی جبلی فہم و دانش سے فارسی میں
طبع آزمائی پر اپنی سیرت کی جولانی طبع کو پیش کرتے تھے۔ دلی کی علمی سوسائٹی
بیرون قلعہ معلیٰ فارسی مشاعروں سے آباد تھی، غالب کا جس میں حصہ بیش از بیش
تھا۔ قلعہ معلیٰ کی دنیا میں اردو کا طوطی بول رہا تھا۔ شاہ نصیر استاد ذوق
جس سفینہ کے کھیون ہار تھے۔ پھر یہ انکے شاگرد ذوق کو میراث میں آئی اسکو بھی
غالب نے ہی کنارے ٹھکانے لگایا۔

اگرچہ یہ مغلیہ ایوان شاہی، انگریزوں کے ہاتھوں کٹ پتلی تھا مگر ہزار سالہ
سلطنت کا چراغ بجھتے بجھتے بھی چراغ سحری ہی سہی پھر بھی ایک شمع افروزی
کا منظر کہ دھوکہ ضرور پیش کر رہا تھا۔ غالب کی بھی دلی خواہش اس دربار سے
وابستگی کی رہتی تھی لیکن انگریزوں سے خاندانی تعلقات ہمیشہ اسمیں حارج رہے
بالآخر گاہے گاہے غالب کو بھی اس دربار میں رسائی ہو جاتی تھی، عید، بقر عید اور
دوسرے تقاریب پر غالب کبھی نہ چوکتے اور قصائد سے دربار مغلیہ کی ضیافت
طبع ضرور کرتے رہتے۔ آخر کار وقت آیا کہ مستقل تعلق بھی انگریزوں ہی کی
بدولت غالب کو میسر آیا کہ جب انگریزوں کے دباؤ سے قلعہ میں مدار المہامی کی
خدمت سیاسی وجوہ پر غالب کے دوست حکیم احسن اللہ خاں کو دلائی گئی جو
برٹش بہادر کے معتمد علیہ خاص تھے تو انھوں نے ان کو بھی گھسیٹا اور غالب یہ
شعر پڑھتے قلعہ کے درباریوں میں داخل ہوئے:—

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دُعا ۔۔ وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

یہی وہ دَور ہے جس میں اُردو غزلیں غالبؔ سے سہل اور شگفتہ زمین میں وجود میں آئیں۔ کیونکہ ظفر کی شاعری ذوقؔ کے تلمذ میں جس نہج پر تھی اُسپر غالبؔ کا استادِ شہ بنکر رہنا اپنی تبدیلی وضع کے بغیر ناممکن تھا۔ اگرچہ غالبؔ نے اپنی طبیعت کو دربار کے آداب کی بھینٹ چڑھا دیا مگر آج غالبؔ کے مقلد کہہ سکتے ہیں کہ غالبؔ آسان سے آسان زمین میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔

کیا کیا خضر نے سکندر سے ۔۔ اب کسے رہنما کرے کوئی

وغیرہ وغیرہ جیسی چیزیں سہل ممتنع غالبؔ کے یہاں پیدا ہوئیں۔

ایک لطیف نکتہ ملاحظہ ہو کہ غالبؔ دنیا میں اپنی نثر نگاری سے نیک نام شہرۂ آفاق بنتے مگر لوگوں کا مذاق شعر پرستی تھا اور غالبؔ بھی اپنی بزرگ وہش سے کسی استادِ وقت سے کم نہ تھے آپ کا فکرِ سخن بہر رنگ استادانہ تھا تو پھر اردو شاعری بھی غالبؔ کے اپنے خاص انوکھے رنگ سے ممتاز تھی تو بالطبع لوگوں نے آپ کو نظم و نثر ہر دو میں صاحب طرز مانا اگرچہ آپکی تقلید نثر نگاری میں نہ ہوسکی لیکن نظم و اشعار میں بطفیل حسرتؔ موہانی آپکی پیروی ہر شاعر نے کی خواہ اُسکا تعلق کسی اسکول سے رہا ہو سبھی آپکے طرزِ تخلیق کے محتاج ہیں اور اُردو شاعری آج دنیائے شعر میں "ملکۂ مسیحائی" کہلاتی ہے۔

غالبؔ کا رنگِ تغزل

غالبؔ کے وقت میں اگرچہ اسکول تو کوئی مستقل امتیازی حیثیت نہ رکھتا تھا دہلی اسکول کی پرچھائیوں میں دبا ہوا تھا۔ اُردو ادب کے صرف دو مرکز تھے۔ دہلی، لکھنؤ۔ لکھنؤ والے صنائع بدائع لفظی کے بیساختہ اجل گرفتہ تھے۔ دہلی والے ہمیشہ معانی آفرینی پر مرتے تھے۔ اسلئے ہر دو مرکز اپنے اپنے رنگ میں

ایک دوسرے کا جواب تھے۔ قدرِ مشترک ہر دو اسکولوں میں یہ امر تھا کہ ہر شاعر یہ کوشش کرتا کہ جس مضمون کو جن تشبیہہ، استعارات کے روپ میں پہلے کہہ گئے ہیں انھیں کو ذرا اچھا کر صورت میں پیش کر دے لیکن غالب نے یہ تہیہ کیا کہ اپنی جدتِ خیالی کی امامت میں اپنی شعری کرامات پیش کرے چنانچہ غالب کا خیال ہے اور یہ اس خیال میں منفرد ہے بلکہ منفرد ہے کہ گویا ایک لفظ کیلئے دس معانی ہوں یا دس لفظوں کے لئے ایک معنیٰ ہو یہ دنیائے حقیقت میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے، ہر ایک لفظ اپنی حقیقت میں ایک ہی کیفیت معنی پیش کرسکتا ہے۔ ایسے ہی ہر شخص کا دماغ اپنی انفرادی شخصیت کے تحت وہ انفرادی شان رکھتا ہے کہ جبکی معنی آفرینی کبھی توارد کے جرم کی مرتکب نہ ہوسکے۔ اسکا ہر پہلوئے خیال اپنی نئی آمد آمد کے لئے ہر وقت خوش آمدید کہنے کے لئے تیار رہے۔ اس لئے غالب کے رنگ تغزل پر تبصرہ کرنے سے پہلے دلی کی شاعری کے عناصر اربعہ شاہ نصیر[۱]۔ مومن[۲]۔ ذوق[۳] اور غالب[۴] کے الگ الگ، جدا گانہ امتیازی رنگ کا اعتراف کرتے ہوئے یہ حقیقت بیان کر دینا ضروری ہے کہ جیسے دوسرے شعراء نے دلی میں شیخ ناسخ کو ثابت کیا۔ شاہ نصیر، ذوق، مومن تینوں کے یہاں شیخ ناسخ کے کلام کی یہ اہم خصوصیت پائی جاتی ہے کہ اخلاقی مضامین کو اس طریقے پر باندھنا کہ جابجا اخلاقی دعوے کرتے رہنا اور اس کو تمثیل سے ثابت کرتے رہنا۔

مثلاً شاہ نصیر ؎ کیا کوئی سر بلند، کرے دعویٔ عروج
سایہ ہے پائمال سدا کوہسار کا

؎ ہے نگوں ساری بھی ساختہ اے ہر دم دنیائے دون
شکلِ فوارہ نہ اپنے اوج پر تو سر اٹھا

*

ذوق ؎ شوق ہے اُس کو بھی طرزِ نالۂ عشاق سے
دم بہ دم چھوڑے ہے منہ سے زور قلیا چھوڑ کر

اور حکیم مومن بھی اسی ناسخ کے ڈگر پر ہی اوّل اوّل چلتے نظر آئے :-
بس کہ میں سارے برس روتا رہا غم میں ترے ؎ جیٹھ اور بیساکھ کا بھی چاند ساون ہو گیا
اور غالب بھی یہی کہتے تھے ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

ان کے یہاں بھی تقلید ناسخ آکر رہی مگر ذرا محتاط صورت میں ؎
یوں بعد ضبط اشک پھروں گرد یار کے ‏ ‏ پانی پیئے کسو پہ کوئی جیسے وار کے
ہم مشق فکر وصل و غم ہجر سے اسد ‏ ‏ لائق نہیں رہے ہیں غم روزگار کے

مانا کہ یہ وہی طرز ناسخ ہے لیکن غالب اپنے دور میں تقلید ناسخ سے بھی بہت پہلے اپنے طبعی تناسخ سے گذر چکے تھے۔ اور یہ تبدیلی اُن کے یہاں کوئی نئی چیز نہ تھی مثلاً سب سے پہلے غالب کا کہنا ہے۔

طرز بیدل میں ریختہ کہنا ـــــ اسد اللہ خاں قیامت ہے

پھر فرماتے ہیں ؎ اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

مرزا غالب نے اوّل اوّل مرزا عبد القادر بیدل بدایونی کی ہمنوائی میں فارسی غزل گوئی شروع کی تھی پھر یہ طرز رفتہ رفتہ بدلنے گئی اور آخر کار عرفی، ظہوری، نظیری طالب آملی کا رنگ تغزل مرزا غالب کے رنگ غزل میں

بتدریج پیدا ہوا۔ خود مرزا اپنے فارسی دیوان کے خاتمے ہیں لکھتے ہیں جسکا ترجمہ یہ ہے :۔

"اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جویا تھی لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ اُن لوگوں کی پیروی کرتا رہا جو راہِ صواب سے نابلد تھے۔ آخر جب اُن لوگوں نے جو اس راہ میں پیشرو تھے دیکھا میں باوجودیکہ اُن کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور بھریے راہ بھٹکتا پھرتا ہوں انکو میرے حال پر رحم آیا اور انھوں نے مجھ پر مربیانہ نگاہ ڈالی شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو دکھائی، طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا جو مادہ مجھ میں تھا اس کو فنا کردیا، ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زادِ راہ باندھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا مجھ کو سکھایا"

مرزا کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بیدل کے رنگ کو چھوڑ نے کے بعد درجہ بدرجہ حزیں۔ آملی۔ عرفی۔ ظہوری وغیرہ کے رنگ کو بھی چھوڑتے ہوئے نظیری کی خاص روش کو اپنانے کی کوشش کی ہے اور اپنے فارسی کلام کے ساتھ مرزا کے اُردو کلام میں بھی یہ انقلاب اُسی وقت پیدا ہوا چنانچہ اُس وقت کے مرزا کے اُردو اشعار جو فارسی اشعار کے ہم معنیٰ ہیں اس تدریجی تبدیلی کا پورا ثبوت دیتے ہیں۔ غالب کے ہر دو کلام اُردو ۔ فارسی کے بالموازنہ ملاحظہ ہوں :۔ فارسی ۔

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت
می تواں یافت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

اُردو ؎ زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

" ؎ کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ؛؛ بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

فارسی ؎ ما ہمائے گرم پرواز یم فیض از ما مجو
سایہ ہم چو دود بالامی رود از بال ما

اُردو ؎ سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسد
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

وغیرہ، غرضیکہ زیادہ تر غالب کے کلام میں نظیری کا رنگ تھا اور یہی رنگ، رنگِ تغزل کی جان ہے فارسی ہو کہ اردو نظیری کہتا ہے۔ ؎
راز درسینہ زرخ پردہ برانداخت دریغ ؛؛ حال ما شہرہ یہ انشائے غزل ساخت دریغ

غالب ؎ :- کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

نظیری ؎ - غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیثِ تو شنیدن ندہم

غالب ؎ :- دیکھنا غیرت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

وغیرہ وغیرہ بہر حال متاخرین شعرائے فارسی کے کلام کی جملہ خصوصیات، فارسی کی طرح اُن کے اُردو کلام میں بھی کافی موجود ہیں۔

اس دَور کی یہ خصوصیت ہے جیسا کہ علامہ شبلی لکھتے ہیں :-

وہ کسی وسیع خیال کو جو متعدد اشعار میں ادا ہو سکتا، ایک ہی شعر میں ادا کر دیتے تھے۔ غالب کے یہاں بھی اس قسم کے اشعار بکثرت موجود ہیں خود اُن کا فرمودہ اس پر شاہد ہے :-

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے ۔ جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

چنانچہ مثال کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو :-

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس شعر میں ایک نہایت ہی وسیع مضمون ادا کیا گیا ہے جس کا تجزیہ حسب ذیل ہے

۱۔ حالت یہ ہے کہ ایک بلبل چمن اور اپنے آشیانے سے جدا ہو کر گرفتار ہو گئی ہے اور قیدِ قفس میں ہے۔

۲۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے باغ میں بجلی گرتے دیکھی ہے اور قفس میں متردد ہے کہ جانے میرا آشیان بچا یا جل گیا۔

۳۔ ایک اور بلبل جو اُس کی ہم صفیر ہمذات اور ہمدم ہے سامنے کے درخت پر آ کر بیٹھی ہے اور اسیرِ قفس بلبل نے اس سے رودادِ چمن پوچھی ہے۔

۴۔ چونکہ اُس کا آشیان جل گیا ہے بلبل ہم صفیر مفصل حال کہتے ہوئے پس و پیش کرتی ہے کہ اس آفت رسیدہ کو اسیری میں کیا آشیانے کے جلنے کی خبر سناؤں۔

۵۔ بلبلِ نو گرفتار کے دل میں اگرچہ اس کا کھٹکا ہے تاہم اس نے اپنے دل کو ڈھارس دے کر مطمئن کر لیا ہے کہ باغ میں ہزاروں آشیانے ہیں

گیا میرے ہی آشیانے پر باغ میں بجلی گری ہوگی، اسلئے وہ اپنے ہمصفیر سے جب روداد چمن پوچھتی ہے، وہ اس کے بیان سے پہلو تہی کرتی ہے تو یہ کہتی ہے کہ گری ہے جسپہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے تو تو احوال چمن سنادے۔ اب اس حالت کے پیش نظر اس شعر پر نظر ڈالیئے تو معلوم ہو کہ کس حسن ترتیب سے ایک ایک لفظ اپنی جگہ اس وسیع مضمون کے پیش کرنے میں اپنی اداکاری بتا رہا ہے۔ بلبل کی تو گرفتاری پر صرف ایک قفس کا لفظ مشیر ہے۔ اس مفہوم کو کہ اس نے خود چمن میں بجلی گرتے ہوئے دیکھی ہے یا زیادہ سے زیادہ صیاد کے گھر والوں کو "باغ میں بجلی گری ہے" کہتے سنا ہے اور فطرتاً اپنے گھونسلے کے بارے میں تردد اک امر طبعی ہے۔ اس مفہوم کو "کل" کے لفظ سے ادا کیا ہے۔ اور اس خیال کو کہ اتفاق سے اُسکا ہم صفیر سامنے کسی شاخ پر آبیٹھا ہے۔ اور روداد چمن اس کے دریافت کرنے پر از روئے ہمدردی وہ جھجکتا ہے اس فقرے میں "تجھ سے روداد چمن کہتے ہوئے ڈر ہمدم" ظاہر کیا ہے۔ ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے اپنے دل کو مضبوط کرکے اس نے روداد چمن دریافت کرنا چاہا۔ اس طریقۂ بیان نے اس مضمون کو کسقدر موثر اور درد انگیز و دلکش بنادیا ہے۔ اسی سلسلے میں غالب کے وہ اشعار بھی داخل ہیں جن میں بہت سے جملے حذف کردیئے جاتے ہیں۔ اور واقعات کی رو میں متروکہ جملے خود بخود سمجھ میں آجاتے ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو کہ ؎

ہاں وہ نہیں وفا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی

جس کو ہوں جان و دل عزیز اُسکی گلی میں جائے کیوں

یہ اس حالت کی محاکاتی تصویر کشی ہے کہ عاشق عشق میں سرشار ہے لوگ سمجھاتے ہیں، ارے معشوق تو بیوفا ہوتے ہیں اسلئے ان سے دل لگانا بیسود ہے۔ عاشق جھلا کے کہتا ہے اچھا ہے تو ہے یہ مانا وہ بیوفا ہی سہی تو جسکو اپنی جان عزیز ہے وہ جان جوکھوں میں کیوں پڑے وہ اس سے دل ہی کیوں لگائے وہ اسکی گلی میں کیوں مارا مارا پھرے۔ جو اپنی جان پر کھیل کر اس سے دل لگائے اسکو اسکی وفا اور بیوفائی سے کیا سروکار جب سر اوکھل میں دیا تو موسلوں کا کیا ڈر، میرا عشق اسکی وفا پر منحصر نہیں۔ میرا مطمح نظر کامیابی نہیں بلکہ میرا معاملہ

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید ٭ یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

پر ہے۔ لیکن اس شعر میں یہ الفاظ کہ لوگ عاشق کو سمجھاتے ہیں اور عاشق بھی معشوق کی وفا کا پابند نہیں بالکل متروک ہیں لیکن تصویر کا جیتا ہوا حصہ خود بخود تصویر کشی کے بہاؤ میں سامنے آجاتا ہے۔ غالب کے دیوان میں اس قسم کے اشعار بکثرت موجود ہیں۔ مومن خاں کا بھی قریب یہی انداز ہے اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ غالب اور ذوق کے مقابلے موازنے بالکل غیر موزوں ہیں۔ یہ دو متضاد ہستیوں کے درمیان محض رسہ کشی استادِ شاہ کی حریفانہ چشمک سے بعد کو پیدا ہوئی جبکہ خود علامہ ذوق کے مرحوم ہونے پر یہ گدی کہ وراثت بیچارے غالب کو ملی تھی تو کونسی اور کہاں کی۔ اس میں رقابت حالات کے تحت ایسا ہوا تھا۔ انگریزوں کی بہی خواہی کی خلیج اگر آڑے نہ آتی تو ممکن تھا کہ قلعۂ معلیٰ میں غالب ہی کا غلبہ غالب رہتا۔ ایسا ہی اگر موازنہ کچھ وزن رکھتا ہے تو وہ مومن، غالب کا ہو سکتا ہے، جو کسی نہ کسی حد تک کسی درجہ میں موزوں

کہا جا سکتا ہے، مگر دنیا آج اندھی تقلید پر ہے۔ الغرض یہ طرز غالب جن متروک جملوں کو اپنے پُر سلیقہ الفاظ کی نشست اور دباؤ میں بیان کر دیتا ہے یہ ایک شاعر کی معجزانہ سحر الکلامی ہے یہ ایسا گورکھ دھندا نہیں کہ ؎

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا ٭ کہ ناحق خون پروانے کا ہو گا

کہ باغ میں پھولوں کا رس چوسنے شہد کی مکھیوں کو جانے ہی نہ دیا جائے کہ نہ وہ وہاں پہونچیں گی اور نہ پھر وہ پھول چوس کر شہد بنائیں گی نہ پھر شہد سے موم علیحدہ ہو کر موم بتی بنے گی نہ شمع جلے گی نہ پروانے مریں گے کہ عادتی طور پر شمع کے ارد گرد پتنگے آتے ہی ہیں تو نہ شمع جلی نہ پروانے جلے۔ اس مگلے کی ٹیڑھی کھیر کی غالب کے یہاں نوبت نہیں آئی کہ خیال و وہم کا تراشہ ہوا کوئی واہمہ پہلے ہی تصور کر لیا جائے تو شعر کے معنی سمجھ میں آئیں۔ غالب کے یہاں تو ذہنی ترتیب اور تراوش پر خود بخود مضامین کا ترتیب موجود ہے۔ غالب کے رنگِ تغزل کا یہ اجمالی خاکہ تھا ورنہ غالب کے تغزل کی اہم خصوصیات جو غالب کی انفرادیت کی حامل ہیں بکثرت ہیں۔ مثلاً :۔

۱۔ غالب کے بعض اشعار ذو معنی ہوتے ہیں اس سے قدرتی طور پر ان کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے مثالاً ملاحظہ ہو ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ٭ ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

ایک مطلب تو یہ ہے کہ ساقی صدا دیتا ہے غالب کے بعد ہر دانہ عشق کی شراب کا حریف کوئی ہے؟ جب کوئی آواز نہیں آتی تو وہ دوبارہ سہ بارہ پکارتا ہے، چیختا ہے اور غالب کی ٹکر کا جواب نہیں پاتا۔ دوسرا مطلب

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غالب کے بعد پہلے بطور استفہام ساقی نہایت بلند آہنگی کے ساتھ پکارتا ہے، کوئی ہے حریف مئے مردانۂ عشق جب کہیں سے جواب نہیں ملتا تو نہایت حسرت آمیز لہجہ میں دبی آواز سے خود ہی چپکے چپکے غالب کے سرانے کو پیش رکھ کر اس مصرعہ کو دہراتا ہے کہ ہاں غالب کے بعد کون ہو سکے گا۔

اس ذہنی تکرار کو غالب نے ع "ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد" سے بیان کیا ہے کہ ہمارے مرنے پیچھے ہی ہمارے گُن گائے جائینگے۔ اور غالب کے اس دیوانچہ میں ایسے اشعار ہم نے بکثرت پائے۔

۲- اس دور کی ایک بڑی خصوصیت استعارات میں جدت اور تشبیہات میں ندرت تھی، غالب، کے کلام میں ان چیزوں کا "باغِ ارم" نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو

بہ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مئے تھا ؛ ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی
نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی ؛ ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر
پی جسقدر ملے شبِ مہتاب میں شراب ؛ اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

۳- غالب صرف متاخرین ہی کی لکیر کے فقیر نہیں بلکہ خواجہ حافظ کا کلام جوشِ بیان کے لحاظ سے جو فارسی میں مرتبہ رکھتا ہے۔ خواجہ صاحب کے مقابلہ میں اُردو میں صرف مرزا غالب پیش ہو سکے ہیں ؏

پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن ! ؛ سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب
گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے ؛ رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

یہ جوشِ بیان اسوقت اور بھی بڑھ جاتا ہے جب اس میں غالب تخاطب کا رنگ پیدا کر دیتے ہیں۔

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک ؛ اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل ؛ زنہار گر تمھیں ہوس نائو نوش ہو
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ؛ میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہو

اے عندلیب اک کفِ خس بہرِ آشیاں ؛ طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

۴ ۔ خواجہ صاحب کی ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ غزل کہتے کہتے کچھ اشعار ممدوح کی مدح میں کہہ جاتے ۔ بعض موقعوں پر یہ غیر متوقع گریز نہایت لطف دے جاتی ، غالب کا بھی یہی انداز ہے ؎

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے ؛ بنا ہے عیش تجمّل حسین خاں کے لئے

اور ملاحظہ ہو :۔ ؎

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے ؛ چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

اور سُنیئے :۔ ؎ خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

۵ ۔ ایرانی شعراء کی تقلید کے بعد اُردو میں بلند رتبہ شاعر صرف میر علیہ الرحمۃ رہ گئے تھے ۔ چنانچہ غالب نے درد و غم حسرت و تمنّا اور یاس و ناکامی کے مضامین میں یہ کہتے ہوئے :۔ ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ ؛ آپ بے بہرہ ہیں جو معتقدِ میر نہیں

اُنھیں کا تتبع کیا ہے ، چنانچہ لکھتے ہیں :۔ ؎

کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ ؛ ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں
منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید ؛ نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

آہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ ٭ کوئی دن اور گر جیے ہوتے

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی ٭ موت آتی ہے پر نہیں آتی

۶۔ حُسنِ معنیٰ کے ساتھ غالبؔ کا کلام حُسنِ الفاظ حُسنِ بندش اور حُسنِ ترکیب کا بھی بہترین نمونہ ہے وہ ایک پُر معنی مضمون آفریں بلند پایہ شاعر ہیں یا امام ناسخ کی طرح کہیں بھدے ثقیل، گراں الفاظ استعمال میں نہیں لاتے بلکہ اُن کی بعض غزلیں فصیح سلیس۔ رواں شستہ الفاظ کا بہترین مجموعہ ہوتی ہیں۔ بندش کی چستی اور حُسنِ ترکیب کی جسقدر بہترین مثالیں اس مختصر سے دیوان میں ملتی ہیں اُن کی نظیر اُردو شعراء کے بڑے سے بڑے دیوانوں میں نا پید امثال ہے۔ ملاحظہ رنگ فرمایئے ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی ٭ دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

پوری غزل اسی رنگ میں ہے ـــــ نیز ملاحظہ ہو ؎

یہ قائل وعدہ صبر آزما کیوں ٭ یہ کافر فتنہ طاقت ربا کیا

پوری غزل کا یہی رنگ ہے ـــــ اور ملاحظہ کیجیے ؎

کوئی دن گر زندگانی اور ہے ٭ اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

پورے اشعار کا یہی رنگ ہے ـــ

واقعی غالبؔ کی بعض سیر حاصل ملبی غزلیں اوّل سے آخر تک حُسنِ بندش کی بہترین مثالیں ہیں مثلاً یہ غزل :ـ

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو ٭ نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر مُنہ میں زباں کیوں ہو

اس غزل کے متعلق مولانا طباطبائی لکھتے ہیں کہ "اس نظم نے وہ بندش

پائی ہے کہ نثر میں بھی ایسے برجستہ فقرے نہیں ہو سکتے۔ بالخصوص اس غزل کے اس شعر کے متعلق ؎

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو؟

مولانا طباطبائی کہتے ہیں کہ بندش اس شعر کی سحر کے مرتبے تک پہونچ گئی ہے۔

غالب کی بندش کا حسن اُسوقت اور زیادہ کھل جاتا ہے جب وہ ایک ہی قسم کے خیالات کو ایک ہی قسم کے طرزِ ادا کے ساتھ ادا کرتے ہیں گویا کہ ایک تجربے کی کیفیت کا سراپا ہزار طریقے سے پیش کرتے ہیں مثلاً ؎

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود ؔ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ؔ - - - - - - - الخ پوری غزل

کچھ اور ملاحظہ ہو:۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے ؔ جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

اور سنیئے ؎

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

بندش کی چستی اور روانی نے ایک خاص صفت پیدا کر دی ہے جسکو صنعت تماثل ترکیب کہتے ہیں یعنی اس صنعت کے تمام فقرے ایک ہی وزن کے ہوتے ہیں جیسے

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ؕ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ؕ

غرضیکہ غالب کی بندش کی چستی نے متعدد اشعار میں یہ صنعت پیدا کر دی ہے۔

تو اور آرائشِ خمِ کاکل ؔ میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو ؛؛ ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا ؛؛ لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجئے ؛؛ ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کیجئے

اُدھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے ؛؛ نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

نہ سنو گر برا کہے کوئی ؛؛ نہ کہو گر برا کرے کوئی

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے ؛؛ کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

تو وہ بدخو کہ تحیّر کو تماشا جانے ؛؛ غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

۷۔ غالب کے کلام میں اگرچہ صنائع بدائع بہت کم ہیں اس رعایت لفظی کو شعرائے لکھنؤ نے بہت زیادہ نمایاں اور عام کر دیا تھا چونکہ یہ غالب کے مذاق سے لگاؤ نہیں کھاتی تھی غالب نے ہم عصروں کے اثر سے نہ محفوظ رہ کر اس صنعت کو اگرچہ برتا لیکن کسی قدر رکھڈاپن جو غالب کے شایانِ شان نہیں پیدا ہو کر ہی رہا۔ مثلاً ؎

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں ؛؛ ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

غالب مرے کلام میں کیونکر مزہ نہ ہو ؛؛ پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں

یعنی شاہ ظفر کے ۔ پھر بھی غالب، غالب تھے۔ اس صنعت میں بھی اپنی بدیع الخیالی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور آج تک شعراء پر آپ کا یہ گرانقدر ناقابلِ فراموش احسان ہے کہ آپکے تتبع میں اُردو شاعری میں یہ صنعتیں کچھ اس قابل استعمال ہو گئی ہیں کہ جن سے کلام کا پھیکا پن مغلوب ہو کر کلام بھس بھسا دکھائی نہیں دیتا۔

(غالب)

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت ٭ میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

پوری غزل اسی صنعت میں ہے باوجود اشتراک لفظی کے غالبؔ کے یہ اشعار خوبی کے بدیع الخیال مانے گئے ہیں۔ **الغرض**، غالبؔ کے یہاں جہاں کہیں رعایت لفظی کی مثالیں نظر آئیں گی اِلّا ماشاءاللہ کسی قدر لطافت اُن میں ضرور ہوگی۔ ملاحظہ ہو ؎ کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا

آئے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

یعنی تشبیہ و تجنیس سے خالی ہے اگرچہ رعایت لفظی ہی سہی مگر کسی کیفیت اور ندرت ضرور لئے ہوئے ہے۔

غالبؔ کی شاعری کا فلسفہ!

تصوف و اخلاق، صوفی منشی اور اس کی مذہبی رندیت

چونکہ مرزا نہایت شگفتہ مزاج ذہین، ذکاوت کے ساتھ قوتِ حافظہ بھی لاجواب رکھتے تھے۔ شوخی، ظرافت اُن کے دم قدم کی برکت اُنکے ساتھ تھی بقول حالیؔ "واقعی وہ اک حیوانِ ظریف تھے" تحریر ہو یا تقریر کوئی بات لطافت ظرافت سے خالی نہ تھی۔ مرزا یہ تمکنت کے ساتھ کہتے جو کچھ کہتے۔ مزاج مروت دوستی نباہ اور وضعداری کا از حد خوگر تھا۔ شعر و سخن سے جو ازلی مناسبت تھی اُسپر ہرمزد فارسی نژاد ملا عبدالصمد کی بچپن کی تربیت فلسفیانہ یہ سب چیزیں فارسی زمین میں کافی گہرائی پہنائی وسعتِ خیالی لئے ہوئے مرزا کی افتادِ طبع کو بتاتی ہیں

فارسی شعراء کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا اور دماغ کی لائبریری میں محفوظ کر رکھا تھا اسلیئے غالب کے یہاں پوری ایرانی شاعری کا فلسفہ من وعن جستہ جستہ مقامات پر نظر آتا ہے گو اسمیں درجۂ اولیت رنگِ تغزل میں نظیری کے اندازِ سخن کا رہا ہے۔"

جب ہم بحیثیت فنِ شعری غالب کے کلام کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم کو حالی کی رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ:۔

میر و مرزا (سودا) سے لیکر ذوق تک جتنے شعراء گذرے ہیں ان کا ایک محدود دائرہ ہے جس سے وہ کم نکلتے ہیں۔ اُن کی بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو مضمون پہلے کسی طور پر بندھ چکا ہے وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب سے بیان کیا جائے کہ اگلی بندشوں سے بڑھ جائے برخلاف اُنکے مرزا نے اپنی غزل کی بنیاد ایسے اچھوتے مضامین پر رکھی ہے جن کو اور شعراء کی فکر نے مس تک نہیں کیا تھا اور معمولی مضمون ایسے طریقے سے ادا کیئے ہیں جو سب سے نرالے ہیں۔

بیشک ہمارا بھی خیال ہے کہ یہ تو ضروری نہیں کہ مرزا کا ہر مضمون نیا ہی ہو۔ البتہ اُنکی طرز ادا خالی از جدت نہیں۔ سالک کو موج سے بیخودی کو دریا سے۔ گرداب کو شعلۂ جوالہ سے۔ مغزِ سر کو پنبۂ بالش سے۔ دانۂ انگور کو عقدۂ جعال سے۔ استخوان کو خشت سے۔ بدن کو قالب سے تشبیہہ دینا غالب ہی کے فکرِ رسا کی جدت طرازی ہے۔

غالب متانت سنجیدگی کو شوخی و ظرافت سے ایسا پیوست کرتے ہیں کہ دونوں ملکر شعر میں لاجواب تڑپ پیدا کردیں۔ سودا۔ انشاء۔ شوخی۔

ظرافت میں غالب سے کہیں بڑھ کر ہیں لیکن وہ جب شوخی پر چڑھ آتے ہیں تو متانت کھو بیٹھتے ہیں۔

ہم بطور اختصار غالب کی شاعری کا پس منظر صرف ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں کہ غالب نے اپنی شاعری میں کیفیاتِ حسن اور وارداتِ حسن کی وہ لامحدود "تاریخِ حسن" پیش کی ہے جسکا عشرِ عشیر تو کیا خواب و خیال بھی پچھلوں کو نہ آیا۔ اسکے ساتھ غالب نے اُن سب ارتقائے زبان کے پلیٹ فارموں پر اپنا کلام پیش کیا ہے جن میں اگلوں نے اور پچھلوں نے اور ہمعصروں نے پیش کیا ہے۔

اردو شاعری میں یہ چیزیں مشقِ سخن کے طور پر برتی گئی ہیں۔ غزل۔ ریختی۔ واسوخت۔ قصیدہ۔ مرثیہ۔ رباعی۔ مثنوی۔ ڈراماتی شاعری۔ مذہبی شاعری۔ صوفیانہ شاعری۔ اخلاقی شاعری۔ فلسفیانہ شاعری۔ اُردو زبان نے بحیثیت ارتقائے زبان ان چیزوں کو پیش کیا ہے اور یہ سب اصنافِ سخن غالب کے یہاں عن وعن موجود ہیں۔ اردو نے ادبی حیثیت سے یہ چیزیں پیش کی ہیں غزل۔ خمریات۔ قصیدہ۔ فخریہ۔ مرثیہ۔ ہجو۔ مثنوی۔ سہرا۔ وصف۔ تشبیہات اور استعارات اور صنائع بدائع یہ چیزیں بھی غالب کے یہاں ملتی ہیں۔

اب ہم ایک مختصر سی تمہید کے بعد چند اشعار بطور شہادت پیش کرتے ہیں۔

قدماء کے دور پر طرزِ قدیم میں کسی قدر تغیر سب سے پہلے مصحفی، انشاء اور جرأت نے کیا خارجی مضامین یعنی خال خال، خدوخال کے ذکر سے بھی غزل کو

آشنا کیا اُس کے بعد دورِ متوسط میں ناسخ، آتش اور اُنکے تلامذہ نے اپنی تمام تر توجہ انھیں خارجی اوصاف کی طرف مبذول رکھی یہاں تک کہ دورِ متاخرین کے اساتذۂ لکھنؤ کے زمانے تک شعراء زلف و گیسو کے پھندے میں اُلجھے رہے لیکن اساتذۂ دہلی نے قدماء کی روش کو بدستور قائم رکھا۔ اُن کی غزلیں حدودِ غزل سرائی سے باہر ہونے نہ پائیں۔ چنانچہ اشعارِ ذیل غالب کے بھی جسکے شاہد عدل ہیں۔

مؤمن ؎ :- حسرتیں میرے نصیبوں میں لکھی ہیں کیا کیا
اتنے دفتر ہیں، کہیں فصل نہیں باب نہیں

غالب ؎ :-
قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے :: کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب :: کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل :: جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے
نیند اُسکی ہے دماغ اُسکا ہے راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جسکے بازو پہ پریشاں ہو گئیں
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ :: ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

اگرچہ صوفیانہ شاعری کی بنیاد دکن میں پڑی اور وہ فلسفۂ تصوف کی شکل میں پروان چڑھتی رہی۔ لیکن بہ حدِ معراجِ کمال غالبؔ کے یہاں اس شکل میں نمودار ہوئی :۔ "صوفیانہ شاعری"

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے ؎ تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

طاعت بغیر غرض :۔

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ ؎ دوزخ میں ڈال دے کوئی لا کر بہشت کو

حیرت لا مکانی :۔

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں ؎ جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں

اثباتِ خودی :۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو ؎ آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

بے مادہ کے جلوۂ تجردِ ذات نہیں ہو سکتا :۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا ہو نہیں سکتی ؎ چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

اخلاقی شاعری!

استغناء

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

استقلال

آئی اگر بلا تو جگر سے ٹلے نہیں
ایرا[1] ہی دے گئے ہم نے بچایا ہے کشت کو

علوئے ہمت

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے کہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

[1] ایرا پنا یعنی حوصلہ۔

عفو درگذر!

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی ؛ نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر بُرا چلے کوئی ؛ بخش دو گر خطا کرے کوئی

فلسفیانہ شاعری

گنگا جمنی ۔ اہرمنی یزدانی :-

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے ؛ بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

تمسک الی اللہ :-

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

عزلت گزینی / گوشہ نشینی

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

اعترافِ جرم!

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

تبھی تو شاہ ظفر بولے تھے کہ ہم تو یہ بھی نہ سمجھتے۔ غالب بولے حضور تو مجھے اب بھی سمجھتے ہیں۔

اب غالب کی شاعری ادبی حیثیت سے اگر دیکھی جائے تو آج جس معراجِ کمال پر اردو شاعری ہے اُس کے اُستادِ ایجاد غالب ہی نظر آتے ہیں۔ بقولِ مصنف شعر الہند :-

"متاخرین کے دور میں شعرائے دہلی نے جنمیں نواب مرزا داغ سب سے زیادہ نامور ہیں اپنے اسکول کی خصوصیت قائم رکھی اور باوجود معاملہ بند اور ادا بند شاعر ہونے کے تغزل کا سر رشتہ ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ لیکن ابتداء میں متاخرین اساتذہ لکھنؤ نے تو اپنی وہی قدیم مخلوط

روشش قائم رکھی البتہ آخر میں جب رام پور میں شعرائے دہلی کا مقابلہ ہوا اور ان کو اپنا قدیم رنگ پھیکا اور بے اثر نظر آیا تو انہوں نے بھی جذبات و واردات کی طرف توجہ کی — شعرائے دورِ جدید بالکل شعرائے دلّی کے متبع ہیں۔ اور سب سے زیادہ ان کو غالب کی روش پسند آئی ہے۔"

لکھنؤ کی طرح دلّی کے شعراء کو عام طور پر خالی لفظی صناعی کی شاعری پسند نہ تھی کہ دلّی ہمیشہ مرکزِ جنگ و جدال و قتال رہی یہاں کی زمین شعری بجز حقائق کے خیالی محلات نہ بنا سکی۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ فرماتے ہیں

شیفتہ کیسے ہی معنی ہوں مگر نامقبول ؛؛ اگر اسلوبِ عبارت میں متانت کم ہو

یہ فیض اثر صحبت غالب ہی کا ہے۔ شعرائے دہلی میں وہ غالب ہی کی واحد شخصیت ہے جس نے بالکل معجزانہ طور پر ایک ہی شعر میں معشوق کی علوئے مرتبت کیساتھ اپنے فخر و غرور کا بھی اظہار کیا اور اس طرح کے عاشقانہ عجز و نیاز کی شان قائم رکھی۔ ملاحظہ ہو:-

رکھنے ہو تم قدم، مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لئے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

عشق نے غالب نکما کر دیا ؛؛ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں ؛؛ فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے

اس معجز طرازی کی جھلک خال خال شعرائے لکھنؤ میں نظر آتی ہے چنانچہ — ناسخ کہتے ہیں:-

مائل نہ ہوئے سجود یہ تیرے حضور میں ؛؛ سر ہرا اور نہ یار بہت پُرغرور ہے

جہاں ناسخ نے اپنے تخرد مباہات کو لفظ "مائل" سے ظاہر کیا ہے کہ عامل نہیں بلکہ صرف مائل وہیں لفظ "یار" میں اپنے جبلی ابتذال کو بھی باقی رکھا ہے۔ اور میر علیہ الرحمہ اپنے انداز گداز میں فرماتے ہیں :۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں ؛؛ اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

غیرت وحمیّت چونکہ اردو شاعری کی عمارت فارسی شاعری کے کھنڈرات پر بنائی گئی ہے اور فارسی شاعری کبھی عربی شاعری کی خصوصیات سے بارور ہو چکی تھی۔ اہل عرب کی معشوقہ نہایت باوقار اور باحیا ہوتی ہے، عرب کا شاعر اپنی معشوقہ تک پہنچ کو سخت دشواریوں کا باعث، اسکی شرم وحیا کو بتاتا ہے یہ خیال خود عربی سے فارسی میں ہوتا ہوا اردو شاعری کی بھی ذہنی شرافت کا باعث بنا ہوا ہے۔ عربی شاعر کہتا ہے :

وَانِّی لَاَسْتَحْیِیْکِ حَتّٰی کَاَنَّمَا ؛؛ عَلَیَّ بِظَہْرِ الْغَیْبِ مِنْکِ رَقِیْبُ

اور میں تجھ سے خود شرم کرتا ہوں گویا کہ تیری طرف سے کوئی تجھ پر پہرہ دار ہے چھپا ہوا نگران ہے اور عرب کا شاعر اس حیا کو عریانی میں بھی باقی رکھتا ہے :۔

وثدیا مثل حق العاج رخصنا ؛؛ حصانا من اکف اللامسینا

اور ان پستانوں کو جو نرم ونازک ہاتھی دانت کی ڈبیہ کی طرح ملیح وصبیح ہیں اور وہ چھونے والے ہاتھوں سے خود کو بچاتی ہیں کسی کو پاس پھٹکنے نہیں دیتی ہیں۔ فارسی شاعر اسی کو اور بحد کمال پہنچا کر کہتا ہے :۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم ؛؛ گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

مجھے رشک وحیا خود اپنی آنکھوں پر ہے تو میں اسے تیرا چہرہ دیکھنے کا موقعہ نہیں دیتا یعنی شرم وحیا کے سبب خود آنکھ نہیں ملا سکتا۔ اور اپنے کانوں کو بھی

تیری بات سننے کا موقعہ نہیں دیتا کہ یہ چشم و گوش تو لطف اٹھائیں اور میں
محروم رہوں اسی جذبہ کو غالب نے مزید لطافت خیال کے ساتھ پیش کیا ہے جو
غیرت اور رقابت کے حسن منظر کو بکمال معراج پہنچا رہا ہے:-

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے ÷ میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

یہاں غالب نے اپنی قسمت کا گلہ کہہ کر کیفیت رشک کو تجدید اپنے کر دیا کہ خود اپنے
سے آپ کو رشک یہی بات کسی شاعر کے یہاں تھی مگر کھل کر پیش نہیں
ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ جذبہ فارسی کے ہرجائی معشوق کے جذبات میں نہیں کہ ان کا
محبوب بقول شبلی "اکثر شاہد بازاری رہا ہے" کچھ مکدر سا ہو گیا تھا پھر
بھی غالب نے اس تکدر کو بھی حیا کے لباس میں چھپا دیا ہے:-

غیر کو یارب وہ کیونکر منع گستاخی کرے ÷ گر حیا بھی اسکو آتی ہے تو شرما جائے ہے

اس میں عشاق کی بوالہوسی کے پیش نظر معشوق کی بے دست و پائی کے
باوجود حیا کا پس منظر موجود ہے۔

(نوٹ): شبلی کی یہ رائے کہ فارسی کا محبوب اکثر شاہد بازاری رہا ہے
اسکا پس منظر بھی حیا ہی تھا کہ مخدرات سے عشق و محبت جتانا خلاف تہذیب
تھا۔ اور خوبصورت ترکی لونڈوں غلاموں سے انس و محبت غیر فطری حد تک
نہ بھی ہو تو بھی امرد پرستی ایرانی ورثہ ضرور تھی اس میں محمود و ایاز جیسے پاکباز
بھی ہیں۔ اور حافظ، جامی، رومی جیسے عرفان حق کے حدی خوان بھی ہیں۔
حافظ کے پورے دیوان کو اسی خصوص میں دیکھ کر کہ فارسی میں ریختی تو ہے
نہیں گویا وہی آمد مذکر کیلئے، وہی آمد مؤنث کے لئے ہے ہمارے نیاز صاحب نے
اس محترم شخصیت پر غیر فطری الزام لگا ہی دیا تھا خدا مرحوم نیاز کو معاف
کرے۔ جہاں دنیا کے اس میخانہ عرفانی سے فال دیکھتی ہے اور دیوان حافظ

ایک عقیدت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ وہاں یہ سہل انگاری ناقابلِ عفو ہی سابق ایڈیٹر نگار کی رہی۔

رندیت بلکہ دہریت!

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ؛؛ بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

یہ رندیت سہی مگر لباس عبدیت اور بندگی کا زیبِ تن ہے۔

ستائش گر ہے زاہد جسقدر اس باغِ رضواں کا ؛؛ وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

اظہار بیان اگرچہ رندیت کی صورت تنفر لئے ہوئے ہے مگر غالب نے اُسے گلدستہ ہی کہا ہے جو مقامِ زہد ہے کہیں بالاتر مقامِ عشق احدیت کو جو حدِ ارتقائے بندگی ہے بتا رہا ہے کہ ہمارے لئے وجہِ کفایت کہ صورتِ قناعت خلدِ رضوانی نہیں ہے۔ ہمیں تو اس سے کہیں بالاتر جانا ہے۔

خمریات!

عربی شعراء میں اخطل، ابونواس اور ایرانی شعراء میں خیام اور حافظ نے اس صنف کو اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا۔ اُردو شاعری میں قدماء کے دورِ تغزل کے بعد رندی اور ہوسناکی کا دَور شروع ہوا تو آتش اور تلامذۂ آتش نے زیادہ شوخی سے یہ خیالات پیش کئے اور متاخرین میں یہ سبیل رواج حضراتِ داغ نے اور یہ سبیل پسند طبع حضرتِ ریاض نے اس صنف میں نمایاں شہرت حاصل کی اور مکمل حصہ لیا۔ مگر حضرتِ ریاض علیہ الرحمہ کے متعلق یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچا ہے اور جو ایک حقیقت ہے کہ عمر بھر ریاض کے لب و دنداں اور مشامِ دماغ دخترِ رز کے وصل سے شرعاً کر طبعاً مجتنب رہے اور دیوان دیکھو تو نرا بیرِ مغاں کا خمخانہ بلکہ میخانہ ہے۔ اور عمر بھر یہی مشغلہ رہا

لیکن غالب کے یہاں باوجود عملاً شراب نوشی کے یہ چیز ایک کیف و وجد کی پُرخمار مستی لئے ہوئے ہے گویا غالب نے مضمون خمر سے خمار شعر کو پُرکیف تر بنا دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :-

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ؎ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا مقصد شراب سے کیفیت حق کو دوبالا کردینا ہے اور یہ پینا پلانا یہ انکا ذاتی مشغلہ کہ مجملاً کہ فعل یہ پرائیویٹ زندگی کا شغل ہے محتسب را درونِ خانہ چہ کار ہے۔ یار کی یاری سے لہٰذا کر اُس کے تعاون سے کام فرماتے ہیں :-

پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے ؎ پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

پھر فرماتے ہیں ؎ رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

وہ چیز جس کے لئے ہو ہمیں بہشت عزیز ؎ سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کئے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین ؎ ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

اظہارِ حقیقت!

یہ رسم زمانہ ہے کہ لوگوں کی حدِ فکر کی وہیں تک رسائی ہے جہاں تک عقیدت و وقت مساعدت کرے۔ ماحول اور تمدن ساتھ دے یہی وجہ ہے کہ ایک کی "بولی" دوسرے کی "گالی" ایک ہی وقت میں ہو سکتی ہے جیسا سوزی کے مناظر، فحش و بدکاری کے مراکز وہیں تک مکروہ محسوس ہوں گے جہاں تک احساس نفرت معاون ہو۔ غلط ماحول میں بے جھجک جن سیہ کاریوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے

صحیح ماحول میں انکی پرچھائیاں بھی ننگِ انسانیت ہوئی ہیں۔ آج یہ صنفِ نازک کی عریانی تہذیبِ حاضرہ کا ایک لازمہ بن چکی ہے۔ کسی کے وہم خیال میں بھی اب یہ بات نہیں رہی کہ عورت کبھی نام حیا کا تھا اسی طرح "شرابی" تبھی تک گالی تھی جب اسکے اِرتکاب کا احساس دل و دماغ میں گناہ تھا۔ اب جبکہ خود حکومتوں کی سرپرستیوں میں یہ محکمہ چل رہا ہے تو پھر عیب کہاں کا۔ جنوب میں ہم نے بطور گالی غصہ میں "نصرانی" کہیں کا کہتے سُنا ہے جو ٹیپو کی ایمانی حرارت کی یادگار سمجھ لیجئے۔ غرضیکہ آج غالبؔ زندہ ہوتے تو ان کا یہ واحد باب کسی شمار و قطار میں نہ تھا۔ خود آپ غالبؔ اپنے بارے میں نہ کہتے کہ :۔

"تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا"

اور پھر شاہ ظفرؔ کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوتی کہ ہم تو جب بھی نہ سمجھتے۔ جبکہ دوسرے فواحش کی طرح یہ بھی آج جزوِ تہذیب ہے۔ ایران میں ایک محفلِ عقد کا آنکھوں دیکھا سماں ایک پروفیسر صاحب نے بیان کیا کہ تمہاری مصری کھجوروں، چھواروں کی جگہ وہاں بنتِ عنب کا دور چلا۔ اور یہ رسم مناکحت ایک تفریحی باغیچہ میں ہوئی وہ زمانہ دور نہیں جب کلب ہوٹل اس تقریب سے سرفراز ہوجائیں گے۔ ہمارے ذہنِ نارسا میں آج ایسی کتنی اعلیٰ شخصیتوں کے تصوّرات ہیں جن کو اس پری پیکر سے ہم صحبتی کا شغل رہا ہے اور ہے اور دنیا باوجود اسکے ان پر کسی قسم کا نکیر نہیں کر پاتی۔ جبکہ بلا تفریق ملّت کلبوں میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں کے بل اسی انگور کی بیٹی کے ادا ہو رہے ہیں۔ جو ہر قسم کی نکتہ چینی اور خوردہ گیری کے عیب سے پاک ہیں۔ آج شراب کا بنانا جرم ہے بینا جرم نہیں کہ حکومت بنائے، آپ نوش فرمائیں۔ گاندھی مہاتما کو قوم کی اس بے راہ روی سے کیا ہی وہاں شانتی میسّر ہوئی ہوگی۔

قصیدہ! غالبؔ کی خودداری اس امر کی مرتکب نہ تھی کہ وہ قصیدے میں سوداؔ کی سوادپیمائی سے یا استاد ذوقؔ کی شاہانہ مدح سرائی سے کام لیتے یہی وجہ ہے کہ ذوقؔ کے قصیدے مشہور ہوئے اور غالبؔ کی غزلیں۔ غالبؔ کی مثال قصیدے کی سرزمین اور بساط پر "تاج نہ جانے آنگن ٹیڑھا" کی ہے آپ قصیدہ لکھتے لکھتے وہی اپنی جبلی غزل گوئی کے ڈگر پر آجاتے ہیں چنانچہ ایک مدحیہ قصیدہ لکھتے لکھتے درج ذیل اشعار بھی لکھ جاتے ہیں۔

ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس ؎ لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا ؎ کاش کے ہوتا قفس کا در کھلا

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے ؎ یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ ؎ زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

ہاتھ سے رکھدی کب ابرو نے کمان ؎ کب کمر سے غمزے کے خنجر کھلا

نامہ کیسا تھ آگیا پیغامِ مرگ ؎ رہگیا خط میری چھاتی پر کھلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال ؎ پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا

دیکھیو غالبؔ سے گر الجھا کوئی!

ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

غور فرمائیے کیا یہ تشبیب ہے قصیدے کی۔ الغرض قدرت نے "ہر کسے را بہر کارے ساختند" ذوقؔ کو شاہانہ خوشامد سرائیوں کے لئے اور غالبؔ کو "تاریخِ حسن" لکھنے کے لئے پیدا کیا تھا چنانچہ غالبؔ ہر موقعہ محل پر اونہیں میں اپنی محاکاتی شاعری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اگر معشوق کا سراپا کھینچتے ہیں تو وہ اپنی جملہ کیفیاتِ حسن کے ساتھ برا جماں ہو جاتا ہے۔ ممدوح کی

مدح کرتے ہیں تو اسکی ذات تمام خصوصیات کے ساتھ مجسّم ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ چنانچہ اسی قصیدے کے اگلے شعر ملاحظہ ہوں :-

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھُلا

تاجِ زریں مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے مُنہ پر کھُلا

بادشاہ کا نام لیتا ہے خطیب
اَب علوئے پایۂ منبر کھُلا

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ
اَب مآلِ سعیِ اسکندر کھُلا

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے
اب فریبِ طغرل و سنجر کھُلا

مولانا طباطبائی غالب کی جدّت پسندی میں لکھتے ہیں کہ شعرا آخر قصیدے میں دعا دینے سے پہلے یہ کہتے ہیں کہ اب میں دعا دیتا ہوں یہ بالکل غیر مربوط سا جملہ غالب کی جدّت طبع پسند طبیعت کو کہاں پسند آتا چنانچہ کسی قصیدے میں اس چیز کو یوں پیش کرتے ہیں

ختم کرتا ہوں اب دُعا یہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار

یعنی دوسرے شعراء کا اتباع نہیں کرتا ——!

مرثیہ ! جذباتِ قلبی کے اظہار کے لئے جسقدر وسعت زمینِ غزل کو قدرت نے بخشی ہے وہ دوسرے اصنافِ سخن کو کب میسّر ہے۔ لیکن قصائد اور مرثیے میں وہ جذبات بروئے کار لائے جاتے ہیں جن کا تعلق ممدوح کے اطوار و افعال اور عادات و شمائل سے ہو فرق ہے تو یہ کہ قصیدے میں وہ فضائل ممدوح کی زندگی میں پیش ہوتے ہیں وہی اگر بطور واحسرتاہ! سفاہر نے کے بعد پیش کئے جائیں تو مرثیہ کہلائیں یہی وجہ ہے کہ عورتوں کا اور بچوں کا مرثیہ کہنا کبھی تو واقعی سخت مشکل تھا اب کوئی موقعہ ملے تو شاید پہلی سی دشواری نہ ہو۔ جب صنفِ نازک کے قصائد زینتِ ادب بن چکے ہیں

چنانچہ ہماری وزیرِ اعظم صاحب پنڈت جواہر لال کے قلمدانِ وزارت سنبھالنے پر ہوا نہ بھی قصیدہ تھا جس کا مقطع ہے۔

کہے گا جا کے جنّت میں یہ بیدلؔ نج کے موقعہ پر
ہے صدر رشکِ پسرِ عالم میں جو آیا تری دُختر
(بیدلؔ)

بچوں کی زندگی میں آنے والے واقعات بطور مرثیہ لائے جا سکتے ہیں کہ زندہ رہتا تو یہ ہوتا وہ ہوتا ایسا ہوتا ویسا ہوتا وغیرہ۔ اور عورتوں میں مسندِ تمدّن پر ان کا وجود کل تک کالعدم نہیں تھا کا طریح فی الطعام کہا تے ہیں تاہم بقدرِ ذائقہ ضرور تھا۔ عرب میں یہ صنفِ سخن کافی درجہ شہرت حاصل کر چکی تھی۔ اکثر شعراء کے یہاں یہ چیز ملتی ہے دیوانِ حماسہ کا باب المراثی مشہور ہے۔

المراثی! اُردو شاعری کی ابتدا بھی مراثی ہی سے ہوئی کہ دکن میں مجالسِ عزّا شہدائے کربلا کے ذکرِ غم کے عنوانوں پہ طبع آزمائی ہوئی ہے شمال میں بھی انیسؔ و دبیرؔ کے یہاں یہ چیز ایک ممتاز فنی حیثیت پر جلوہ افروز ہے۔

غالبؔ چونکہ ہر فن مولیٰ ہر زمینِ سخن کے مردِ میدان تھے گو ان کا میلانِ طبع میدانِ تغزل تھا مگر فطرتاً طبعاً اور عادتاً گانا اور رونا کسے نہیں آتا۔ انہوں نے بھی اپنی بیوی کے بھانجہ کا جو مرثیہ لکھا ہے۔ مرثیہ کی زمین میں وہ گہرائی، گیرائی، پیدائی اور وسعتوں کی راہیں نکالی ہیں کہ اگر اس طرزِ ایجاد غالبؔ پر غالبؔ کے بعد کوئی چلا ہوتا تو یہ صنفِ سخن بھی انیسؔ و دبیرؔ کے کارناموں کو ماند کر دیتی جن کا عمر بھر کا یہی واحد مرثیہ گوئی مشغلہ رہا اور اک شخصی دائرہ سے نکل کر فنی حیثیت سے صنفِ سخن میں عموم کا درجہ لے لیتی چند شعر مرثیہ غالبؔ کے ملاحظہ ہوں:—

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور ؛ تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں ؛ مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت میں ملیں گے ؛ کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی ؛ بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گذری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش ؛ کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

یہ مرثیہ جن سہل ممتنعات جذبات کو پیش کرتا ہے یہ غالب ہی کی طرزِ ادا کی جدّت اور انوکھا پن ہے۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف ؛ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

غالب قبل از وقت مرنے کا الزام عارف کو دیتے ہیں اس طرزِ خطاب سے مرثیہ اپنی شانِ رثا میں بے عدیل و بے نظیر ہو گیا ہے چنانچہ کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے ؛ کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

ایک اور مرثیہ بھی غالب کا اپنے کسی جوانی کے محبوب کے بارے میں تذکروں میں ملتا ہے۔ وہ بھی اپنے اندازِ بیان میں وہی رقت وہی درد انگیزی جو غالب کے بیان کا جوہر ہے پیش کرتا ہے جس کو ہم نے "جوانی کے مشاغل" عنوان میں کچھ تفصیل سے پیش کر دیا ہے۔ یہاں دہراتا اب ایک غیر ضروری سا ہے صرف پہلا شعر تذکارِ خیال کے لئے لکھ دیا گیا ہے پورے اشعار وہاں دیکھ لئے جائیں۔ ملاحظہ ہو :—

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

عرب میں خنساء مشہور مرثیہ گو شاعرہ گذری ہے غالب کا اندازِ بیان مرثیے کی حد میں اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ عرب میں عام خیال خنساء کے متعلق مرثیہ میں یدِ طولیٰ کا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ یوں تو عرب کے مراثی اپنی

سے نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر غالب کی بیوی کے چچا زاد بھائی۔

فطری شاعری کے بل پر بحیثیت کامیاب رہیں۔ سبھی شعراء مرثیہ کہتے ہیں لیکن خنساء
نے اپنے بھائی کا مرثیہ کہا جو ایک آفاقی شہرہ آفاق شہرت کو پہنچا پورے عرب
میں اسکی دھوم تھی چنانچہ حضرت عمر رضہ نے بھی اسی واہمہ کی بنا پر اپنے بھائی
زید کا مرثیہ لکھوایا۔ خنساء نے لکھدیا۔ حضرت عمر رضہ بولے کہ اس میں تو وہ زور
وہ تاثیر نہیں ہے خنساء نے جواب میں کہا۔ وہ تو امیرالمومنین میرا بھائی تھا اور
یہ آپکے بھائی کا ہے یعنی اپنے بھائی کے مرثیے میں جذبات کے لئے تہیج، محرک
میرے لئے موجود تھے۔ اور یہاں فنی صناعی ہے۔

غرضیکہ یہ غالب ہی تھے کہ رومان میں بھی انہوں نے اپنے جذبات کو
مرثیہ کی شکل میں پیش کر دکھایا۔ اگرچہ مومن کے یہاں بھی معشوق کا طویل
طویل مرثیہ ہے مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ اس میں زیادہ تر تصنع اور
اور مضمون آفرینی میں لکھنؤ کی زبان اور طرز بیان سے کام لیا گیا ہے۔ یہ
چیز اگرچہ متاخرین کے یہاں داغ۔ امیر۔ جلال اور اسکے بعد خاصی کافی
درد انگیزی لئے ہوئے پائی گئی ہے مگر غالب کی ندرت کہاں ---!!!

سہرا !
ہم نہایت افسوس کے ساتھ اس عنوان پر اپنا عجز بیان پیش
کرتے ہیں کہ غالب کے ہوئے قلم سے کسی کے متعلق اشارتاً کنایتاً
بھی کوئی چیز دیکھنے میں نہ آئی بہت کھینچ تان کر کہ مضمون تشنہ نہ رہے کوشش
کی جائے تو وہ مقطع سہرے کا ذوق کے مقابلے میں ہے جو لکھا ہے شاید
لایا جا سکے۔ ملاحظہ ہو:-

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں ☆ دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ

اس سہرے کے مقطع میں بہ ظاہر ذوق کی بیجا مفاخرت کا غالب نے جواب دیا تھا وہ آخر استاد شہ تھا۔ غالب کو شاہ کی خفگی کا جب احساس ہوا تو پھر معذرت بھی کر دی کہ یہ شاعرانہ تعلّی کہ لن ترانی محض تھی کسی کی طرف روئے سخن نہ تھا۔ تاہم تاویل ہی سہی مگر وجہ معقول ہے۔ بس ہجو اس سے زیادہ غالب کے یہاں ناممکنات سے ہی سمجھیئے —— اور ادبی چشمکیں اصناف سخن نہیں ہیں وہ تو ادب کے لئے اظہار ادب ہیں۔

مثنوی! اس سرزمین میں بھی غالب کا قلم خشک نظر آتا ہے اس لئے کہ غالب فرضی تفکرات کو لباس قلم پہنانے کے لئے اپنی ہتک محسوس کرتے تھے اور مثنوی میں دورازکار دور از تخیل ایک فرضی افسانہ پیش کیا جاتا ہے جسکے لئے بیکار مباش کچھ کیا کر۔ فرصت درکار ہے غالب کو اس قسم کی زندگی کا موقعہ ہی کہاں مل سکا۔ اسکے باوجود دیوان غالب کا دوسرا ایڈیشن جو ۱۲۱۸ھ میں طبع ہوا جسکی تعداد اشعار ۱۷۹۲ ہے اسکی ترتیب یہ ہے کہ پہلے مرزا کا دیباچۂ فارسی پھر قطعات پھر ایک مثنوی، قصیدے، غزلیں اور رباعیاں اور آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب نیّر درخشاں کی تقریظ ہے اور ۱۲۷۸ھ کے ایڈیشن میں غالب کے فارسی دیباچے کے بعد غزلیات پھر چار قصیدے ۲ دو حضرت علی رضہ کی منقبت میں اور ۲ دو بہادر شاہ کی مدحت میں اس کے بعد صفتِ انبہ کی مثنوی پھر قطعات اور آخر میں رباعیات۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے کل دو مثنویاں اردو میں لکھی ہیں۔ جہاں فارسی میں غالب کے ہزاروں اشعار کا کلیات اور ہزار سے اوپر کی مثنوی موجود ہے اس کے مقابل صفتِ انبہ کی مثنوی کو مثنوی کہنے کی بجائے قصیدہ در شانِ انبہ

کہنا زیادہ موزوں ہوگا بلکہ میرے خیال میں تو قصیدہ سے بھی زیادہ موزوں تر یہ ہے کہ اسے ایک نظم مسلسل کہنا چاہیئے نہ کہ قصیدہ کہ وہاں بھی ممدوح کا ذی شعور ذی عقل ہونا ضروری ہے۔ تاہم کلام غالب اس سے بھی خالی نہیں ہے۔ نیز منشی بہاری لال مشتاق کا بیان ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ کنہیا لال ایک صاحب آگرہ کے رہنے والے جنکے پاس سے یہ مثنوی پتنگ سے متعلق ملی جبکہ غالب کی عمر آٹھ نو برس کی تھی۔ اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظمیں جو مسلسل کسی خاص چیز پر اُن کے قلم سے ٹپکی ہیں ان کو مجازاً ہی مثنوی کہدیا گیا ہے کہ مثنوی میں بھی آخر کوئی پلاٹ ہوتا ہے ہیرو ہیروئن اور دوسرے افراد قصہ ہوتے ہیں وہ ایک قسم کا منظوم ڈرامہ ہوتی ہے اور اردو میں تو پہلا ناٹک اندر سبھا امانت کا منظوم ہی تھا وہ مثنوی ہی تھا یہی وجہ ہے کہ یہ چیز مرزا کے مزاج اور اُسکی طبیعت سے اُتری ہوئی تھی کہ وہ باوجود یاد دہانی کے یاد نہ آئی جبتک کہ لالہ میاں نے لاکر نہ بتائی اور غالب نے آنکھوں سے نہ دیکھ لیا۔ ہم یہاں سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ غالب کا کلام بچپن میں بھی وہی قادر الکلامی لئے ہوئے تھا جو پختہ عمری میں تھی ورنہ عاذ نا یہ بچپن کی چیز بھی ضرور نظر ثانی سے نوازی جاتی اور کچھ نہ کچھ کم و بیشی اسمیں ضرور ہوتی صرف تفریحاً کسی کا مشہور فارسی شعر اسکے آخر میں لگا دیا۔ اور ان نظموں کو قصیدہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ قصیدہ میں اوّل تو کسی ذی شعور ممدوح کی مدح ہو پھر تشبیب گریز بیان مناقب، دعا، خاتمہ غرض مدعا یہ سب کچھ ہو تو قصیدہ ہے۔ یہ آم کی تعریف ہو کہ پتنگ کی ایک نظم مسلسل ہی کہلائی جا سکے گی اور غالب کا دامن فکر شعری ان تخیلات، توہمات سے اگر بے داغ ہے تو اس کے ادبی مراتب میں کوئی وجہ نقص نہیں۔
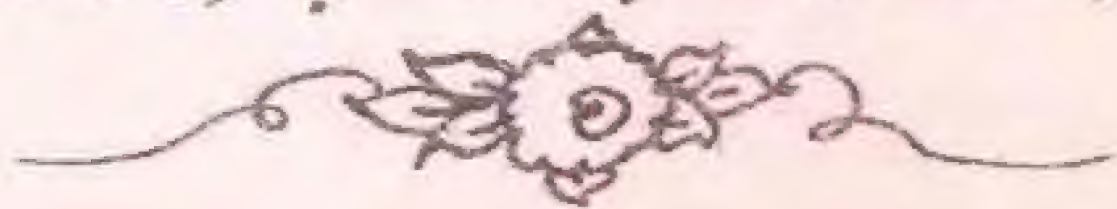
سہرا

یہ چیز خالص اُردو شاعری کی اپنی چیز ہے کیونکہ تہنیتوں کے موقعہ پر پھول کے گجرے سہرے کا رواج ہندوستان میں تھا اور ہے اور اسی کیساتھ یہ کتابی منظوم جہت کا بھی رواج ہو گیا۔ غالبؔ اور ذوقؔ ہر دو استادِ وقت کا تعلق قلعۂ معلی سے ایک کا تو استادِ شہ کا تھا اور دوسرے کا علمی وقار ایسا تھا کہ غالبؔ قلعہ کی شاہانہ تقریبات پر تہنیت، قطعے، اور سہرے ضرور بھیجتے تھے۔

مولنا طبا طبائی نے اپنی شرح دیوانِ غالبؔ میں اور مولنا نواب سید امداد امام اثرؔ نے کاشف الحقائق میں ان دونوں کے سہروں کے متعلق اپنے خیالات پیش کئے ہیں جنکا ماحصل یہی ہے کہ "ذوقؔ کا سہرا غالبؔ کے سہرے کے مقابلہ میں کوئی حیثیت قائم نہ کر سکا" یعنی اس سہرے کا سہرا غالبؔ کے ہی سر رہا چنانچہ ع ہم سخن فہم ہیں الخ یہ مقطع غالبؔ کے سہرے کا بادشاہ نے سنا تو بادشاہ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ ہم پر چوٹ ہے کہ ذوقؔ کو ملک الشعراء بنانا سخن فہمی سے بعید ہے بلکہ نری طرفداری ہے چنانچہ اسی دن جب ذوقؔ حسبِ معمول آئے تو بادشاہ نے وہ سہرا دیا حسب الحکم ذوقؔ نے بھی اس زمین میں ایک سہرا لکھا غالبؔ کے ہر شعر کا جواب دیا ان ہر دو سہروں کا مقابلہ ملاحظہ ہو:-

غالبؔ

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

ذوقؔ

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

یہ پورے سہرے ہر دو کے دیوانوں میں موجود ہیں۔ ذوقؔ کا شعر بندش اور جوشِ بیان کے لحاظ سے غالبؔ کے بیان سے بڑھا ہوا نہیں ہے تو کچھ کم بھی نہیں،

اور محاورہ بھی اُسکے یہاں صحیح ہی مستعمل ہوا ہے "جو زیب سر سہرا ہے" وہ ذوق کے یہاں دوسرے مصرعہ میں ہے اور غالب کے یہاں پہلے مصرعہ میں۔ باقی پورا سہرا ذوق کا غالب کے سہرے کے مقابلے میں کوئی اُستادی رنگ نہیں جما سکا غالب کے ایک ایک شعر کا جواب ذوق نے کئی کئی شعروں میں دیا ہے اور بعض کا دے ہی نہ سکا۔ جیسا کہ ہم اپنی پچھلی بحثوں میں کہہ آئے ہیں کہ "زیور" کا قافیہ جو مناسب اور اہم تر تھا پھر بھی ذوق کے یہاں ناپید رہا جو غالب کی قادر الکلامی پر نشاندہی ہے جبکہ ذوق نے ایک چیز کو سامنے رکھ کر اور بادشاہ کے سوچا اور پھر لکھا اور غالب نے اپنی عادتی بے خیالی میں ایک وقتی تقاضے کے تحت لکھا یہ بڑی چیز ہے۔

اجزائے شعر!

شعر کا جب تجزیہ کیا جاتا ہے تو اُس میں صدر و عجز عروض و قوافی اور وزن و زحافات و غیرہ میں ردیف و قافیہ

ایک ایسے اہم جزو ہیں جن کے بغیر شعر میں کمالِ حُسن پیدا ہو ہی نہیں سکتا بلکہ یہ تو شعر کی حیاتِ حُسن کا جوہر اور عنصر کہلاتے ہیں۔ یہ چیز جیسا کہ عربی میں کچھ موزوں تر شکل میں تھی ابتدا فارسی میں بھی قدماء کے یہاں کچھ زیادہ پابندی کے ساتھ نہیں تھی پھر بھی اسکی اہمیت بعد کو اُنکے یہاں بھی مسلم رہی اور اُردو شاعری میں تو یہ بنیادی عنصر اجزائے شعر کی کہلاتی ہے، یہی نہیں بلکہ آج کی اُردو شاعری میں پورے اجزائے شعر کی پوری پوری رعایت حدود شعر میں لازمی ہے کہ شعر موسیقی کی غنائیت سے ہم آہنگ رہے۔ بعض نفاست پسند شاعر تو بحریں تک انتخابی استعمال کرتے ہیں جن میں غنائیت کا شعور کافی ہو اور بعض زحافات سے قصداً احتراز کرتے ہیں اور سالم بحروں میں طبع آزمائی مخصوص پسند خاطر ہے۔

اگرچہ ضروریاتِ شعری نے بحروں میں ایک خاص حد تک سہولت کی خاطر زحافات کو تسلیم کیا ہے اور ہر ہر بحر کے خاص خاص زحاف ہیں۔ گویا یہ بھی بحروں کے ذیلی قسم کے اقسام ہیں۔ اور تنوع کے لئے مستعمل ہوئے ہیں۔ لیکن ضروریاتِ شعری پر غلط الفاظ کا استعمال ہلکے درجہ کے شعر گو طبقہ میں سند جواز حاصل کرلے تو کرلے اور ورنہ پختہ قادر الکلامی اس عیب کو کسی صورت برداشت نہیں کرتی۔ یہاں تک کہ اس دور منذلزل سے پہلے مثلاً "شہاب" بکسر شین عربی لفظ ہے اور اردو میں بفتح شین مستعمل ہے۔ تو پھر اسکے دوسرے ردیف کتاب، حساب، خطاب وغیرہ نہ لاتے بلکہ صواب، ثواب، جواب، سحاب، نقاب وغیرہ لاتے بعد کو یہ حفظ رعایت شاید کچھ ہنگی پڑتی تھی کہ اسکا التزام باقی نہ رہا۔ الغرض تحریک ساکن ہو کہ اسکا متحرک اور اختلافِ حرکات سبھی عیوب شعری میں داخل ہیں۔

بشریت وہی ہے جو خطا و نسیان سے مرکب ہو۔ عصمت صرف لازمہ نبوت اور حقِ ملکوتیت ہے۔ اسلئے غالبؔ کے بھی اس "اختر کھلا - دفتر کھلا" والی غزل اور اشعارِ سہرا میں کچھ سقم ردیف و قوافی کے ملتے ہیں جنکے نشاندہی تکملہ میں تصویر کے دوسرے رُخ میں ملاحظہ ہو تا کہ تصویر غالبؔ "بیر غالبؔ" میں پوری آئینہ ہو جائے۔ یہ تو ایک لفظی بحث تھی مگر اجزائے شعر میں جو لطف مرصع مسجع تقابل سے پیدا کیا جاتا ہے۔ اور جو شعر کی جان کہلاتا ہے اُس میں بھی غالبؔ کسی سے پیچھے نہیں ہیں چنانچہ ملاحظہ ہو۔ ؎

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں

لالہ وگل کا جوش ہے بلبلوں کا خروش ہے ؛ فصلِ وداع ہوش ہے موسمِ ناؤ نوش ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طبلہ پر تھاپ پڑ رہی ہے اور اس سے مختلف سُر، موسیقی کے اپنے خاص آہنگ میں نکل رہے ہیں۔

ایسے ہی اجزائے شعر سے متعلق غالبؔ کے کلام میں ایک یہ خصوصیت تھی کہ بندش الفاظ خود بخود بقیہ الفاظ کی رہبری کرتی رہتی ہے چنانچہ سے

وہ بادہ نوش ہوں جاتا تھا جب بستاں میں ؛ بغل میں رہتی تھی بوتل ۔۔۔ کے بدلے

چنانچہ یہاں منقوط جگہ میں خود آپ کا دماغ "کتاب" پڑھ لے گا۔ اور درج ذیل شعر میں حبابِ الٰہی میکدہ میں موج مئے سے طوفاں ہو ؛ ہے بے بھریں ساغر ۔ کے بدلے

یعنی اس کمالِ غالبؔ کی اقتدا آج بھی اردو شاعری کا زیور کمال سمجھی جاتی ہے کہ قافیہ کے علم کی صورت میں آنے والے قافیہ کا الفاظ کی بندش سے پتہ چل جائے۔

جن پُرجوش خیالات کے لئے اظہارِ بیان جن مخصوص بحروں میں ہوتا ہے غالبؔ کی فکر شعری نے ان سب میں طبع آزمائی کی ہے مثلاً سے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی ؛ امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے ؛ چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

دائم پڑا ہوا ترے در پہ نہیں ہوں میں ؛ خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

نیز غالبؔ نے ایسی سنگلاخ زمینوں میں بھی تراوشِ فکر کی ہے جو دوسروں کے لئے باوجود قادر سخن ہونے کے ابھی تک اَن چھوئی رہی ہیں۔ لیکن زمانہ کی رَو

میں بہہ جانا انسانی کمزوری کی ایک بڑی خوبی ہے - اسکو عیب سمجھنا فاش غلطی ہے۔ اسکی نشاندہی بھی "تصویر کے دوسرے رُخ" عنوان میں ملاحظہ ہو

غالب کے بعد شاعری میں ایک ایسا رجحان پایا جاتا ہے جس سے شاعری ملکوتی صفات کی آئینہ دار بنتی جا رہی ہے۔ اردو غزل میں بھاشا اور سنسکرت کی بحریں بہت سی آگئیں اور خلیل کی قدیم سولہ بحروں کا زمانہ نہیں رہا۔ حفیظ جالندھری نے بھی بہت سی ہندی بحریں مستزاد کر دی ہیں۔ فلمی بحروں کے سوانگ کو چھوڑ کر اور "بلینک ورس" کی بدذوقی سے گذرتے ہوئے بھی آج اردو شاعری میں پچاس پچپن بحریں مستعمل ہیں جن میں کچھ میر کی بھی ایجادات سے ہیں"۔ میر کہتے ہیں :۔

اُلٹی ہو گئی سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا ٭ دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

پلکیں پھری ہیں کھنچی بھویں ہیں ترچھی تیکھی نگاہیں ہیں
اس اوباش کی سادگی دیکھو شوخی سے ہم چاہیں ہیں

ہم غالب کو اس طرزِ ادا میں غلبۂ جنونِ فارسیت کے سبب اگر معذور سمجھیں تو غالب کا یہ شعر گواہ ہے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد ٭ پر طبیعت ادھر نہیں آتی

جب کلامِ غالب میں :۔

کب وہ سنتا ہے کہانی میری ٭ اور پھر وہ بھی زبانی میری

جیسی سلاست کے اشعار موجود ہیں تو پھر سنسکرت نوازی کی آمیزش کے اشعار کوئی تعجب نہ تھا مگر غالب کے یہاں افضل جیزان کا اپنا خاص رنگِ تغزل تھا۔ وہ قصیدے کہتے ہیں تو غزل کا دھوکہ۔ مرثیہ لکھتے ہیں تو غزل کیا شبہ اور سہرا بھی کہیں تو غزل ہی کی تراوش "

غالبؔ کی مقبولیت

جسوقت غالبؔ اپنی دماغی کاوش سے میدانِ شعر میں نبرد آزما تھے۔ اُسوقت اُنکے انوکھے بیان سے گو عوام لطف اندوز نہ ہوسکے بلکہ مرنے کے پچاس برس بعد اُن کے کلام کو صحیفہ فطرت کا درجہ اُنکے محاسنِ شعری کے سبب دیا گیا اسلئے کہ جسوقت یہ اپنے ہم چشموں کے ساتھ دنیائے شعر کی رزمگاہ میں مصروف کارزار تھے اُسوقت اُن کے ہم عصر جس پرانی زمین پر تخم شعر کی کاشت کرتے تھے غالبؔ کو فطرتاً اس سے طبعی تنفر تھا۔ اسکی وجہ انکا فطری شاعر ہونا اور انکے بالمقابل دوسروں کا محض جذباتِ شعری کا نقال ہونا ایک امر حقیقت تھا۔ شاعر کہتے ہیں قوم کے اُس ذی حس عنصر کو جو اپنی ذہانت اور اپنی بڑھی ہوئی قوتِ متخیلہ سے قوم کے جذبات اور لطیف احساسات کو مشاہدہ پر اپنی زبان سے ایسے شگفتہ طرز اُس قوم کے سامنے پیش کرے کہ افراد قوم اسکے کلام کو سہل ممتنع سمجھتے ہوئے اُسے اپنا ترجمان سمجھیں۔ اور یہ بھی قوم و ملت کی ترجمانی کرے۔ ؎

شاعری تصویرِ ناطق ہے دِلی جذبات کی
راہبر ملت ہے شاعر، ہے دلیل اس بات کی (بیدل)

یہ عطا جیسے غالبؔ کی فطری جدتِ طبع میں قدرتِ فیاض نے اُسکے بلند احساس پر کچھ زیادہ ودیعت کی تھی جسکی روشنی میں اس نے قوم کے حال میں مستقبل کی صحیح شکل بھی مشاہدہ کی اور جو کچھ اس نے قلم سے ظاہر کیا تھا وہ آنے والے جذباتِ قومی کا پیش منظر تھا۔ اِسلئے دقت اُسکے جذبات و افکار اور اُس کے

واردات قلبی کا ہمنوا نہو سکا۔ اِسکی بھی ایک خاص وجہ یہ بھی کہ اُردو شاعری اپنی مبتذل اور پامال تشبیہوں کے سبب ترقی کرتی کرتی جس موڑ پر آکر رکی تھی اَب اُس میں اِن بوسیدہ مستعمل استعاروں کنایوں تشبیہوں کے سبب مزید سکت قوت اور صلاحیت پنپنے پھیلنے پھولنے کی نہ تھی۔ فطرت بیتاب تھی کہ کوئی نیا میدان اپنی جولان گاہ کے لئے تلاش کرے۔ غالب کے ہم عصر شعرا جو ایک حد تک بجائے شاعر متشاعر تھے۔ اور سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار کے ٹمٹماتے چراغ سے اکتساب نور شاہی دادو دہش کی صورت میں حاصل کر رہے تھے وہ اپنے مزاج شخصی کی پرانی ساخت پر اپنے طرز کو بدلنے کی صلاحیت اپنے اندر نہ رکھتے تھے اور وہ اُس برتری کو جو بادشاہ کی اُستادی کی صورت میں اور ہم مجلسی کی صورت میں ہم پیالہ و ہم نوالہ مجلس مشاعرے کی صحبت میں اُن کو میسر آئی تھی چھوڑنے پر تیار نہ تھے وہ اس اعزاز کو اس قدر آسان اور مفت غالب کی جدّت شعری کے عوض دینا نہ چاہتے تھے۔ غالب اپنے کو لاکھ غالب مو سمجھتے لیکن نہ دربار میں رسائی نہ ملک و قوم میں قدر و منزلت تھی۔ دربار میں اُسان اُردو کے مشاعرے ہوتے تھے۔ اور پبلک میں رواجی فارسی کے مشاعرے تھے۔ اور غالب "ازاں سو رانده ازیں سو درمانده" تھے نہ اُسکے شائق تھے نہ اِسکے خواہاں اپنی روشِ خاص پہ پابجولاں۔

جب قانون قضا و قدر کے بر عمال یہ شاہی مشاعروں کے میر مجلس یکے بعد دیگر ختم ہوئے کہ پہلے شاہ نصیر چل بسے تو ذوق کو یہ بھاگ لگے جب وہ بھی مرحوم ہوئے یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ "وَوَ کَبَّرْنَا مَوْتُ الْکُبَرَاءِ" والی بات ہے۔ مگر اتنا ضرور کہیں گے کہ غالب کو بادشاہ کی اُستادی بحالت مجبوری میسر آئی

جن کے وجوہات آپ پچھلے بیانوں میں ملاحظہ کر چکے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا ذوق کے
ذوقِ شعر کا کہ اُس نے ظفر کے بھی چار دیوان مرتب کئے اور اپنے لئے بھی ایک فربہ
تنومند حجم والا دیوان مع ایک دیوان زادے "قصائد" کے چھوڑا ذوق کے قصائد ہی
کو اگر غالب کے چھریرے دیوان سے تولا جائے تو شاید وزن تعداد اشعار قصائد کا ہی بڑھ
جائے۔ لیکن یہ شاعری اُسی آسمانِ شعر کے نیچے ہو رہی تھی جس کے غیاب انجم کی شب ظلمت
اپنی شب کوری میں تھی یہ تھا میر و مصحفی سے اُترتا اُترتا ذوق تک جن گھٹا ٹوپ
اندھیاریوں میں گھرا ہوا تھا وہ عوام کے ذوق کو اسقدر بد ذوق بنا چکا تھا کہ
اس میں کوئی تفنن طبع تھا نہ کوئی دلچسپی۔

یہ پرانی رسم اپنی مکمل بے بساطی کے سبب دیوارِ کہنہ کی طرح کھڑی تھی اور
اُسی لکیر کے فقیر سب اُسی پہ چل رہے تھے کہ غدر کا انقلاب ذہنوں کی انقلابی کیفیتوں
کا سبب بنا۔ قلعۂ معلّے سے شاعری کی بساط لپیٹ دی گئی کہ قلعہ ہی نہ رہا اور بالآخر
دلی ظفر کے ہاتھ سے پل میں نکل گئی۔ بصد ہزار تاسف سبھوں کی زبان پر تھا۔
نہ دور مرفہ الحالی کا باقی جو اس آخری دورِ مغلیہ تک جھومتا رہا وہ بھی
محکومیت میں مفلوک الحالی سے تھک کر بیٹھ گیا اب گل و بلبل کی رسمی شاعری کیلئے
کوئی میدانِ طبع آزمائی نہ تھا بلکہ دامانِ حیات ہی سمٹا ہوا تھا بالخصوص مسلمانوں کا
وہ قافیہ تنگ تھا کہ یہ قافیہ پیمائی بھی خواب و خیال تھی۔۔ یہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں
کہ انگریزوں نے ہندو برادران کو حلیف اور مسلمانوں کو خواہ مخواہ حریف سمجھ کر سات
سال دلی دروازہ کے باہر چن چن کر مسلمانوں کے علماء، صلحاء اور عمائدینِ ملت کو پھانسی
دی جس سے "وہ خونی دروازہ" ہی مشہور ہو گیا۔ چنانچہ غالب نے بھی اپنے کسی خط میں

یہ تصریح کی ہے کہ "اب مسلمانوں کو گھر کر ا بہ پر ملنے لگے ہیں" یہ واقعہ غدر کے ستائیس
بعد کا ہے۔ اگرچہ اس جنگِ آزادی میں ہندو مسلم برابر کے شریک تھے مگر انگریز ڈپلومیسی
نے ایک کو مصلحتاً حلیف دوسرے کو حریف بنا کر منافرت کی خلیج روزِ اول سے حائل
کر دی۔ اس یکطرفہ ڈگری نے سات سال کے اس طویل عرصہ میں کافی بعد پیدا کر دیا۔
اگرچہ برسوں کا اتحاد ہندو مسلم ختم تو نہ ہو سکا مگر مضمحل ضرور ہو گیا۔ اور آئندہ کیلئے
داغ بیل دوئی کی پڑ گئی۔ آخر کار سر سید وغیرہ کی کوششوں سے مسلمانوں کا
اتنا خون پی کر انگریزوں کی پیاس بجھ چکی۔ وہ علماء کا طبقہ جو اس دار و گیر سے
بچ رہا وہ تو ادب سے تعلق رکھتا تھا نہ سیاست سے وہ تو اپنا بستر بوریا تمدن کے
چبوترے پر سے ہی لپیٹ کر ایسا نو دو گیارہ ہوا کہ بس صحنِ مسجد سے حجرۂ مسجد تک
اپنی جولانی طبع کو جہادِ اکبر سمجھ بیٹھا پھر کہیں جا کر دورِ خلافت میں کچھ حصہ
شیخ الہندؒ کی کرامت سے اور سعی سے جاگا اور آج کی آزادی میں برابر کا حقدار
رہا۔ چنانچہ ہندو مسلم دماغوں میں اس غدر کے بعد جو بیداری پیدا ہوئی وہ کچھ سنجیدگی
کی حامل تھی تو غالب کے طرزِ بیان کو غیر شعوری حالات میں اپنانے کا موقع ملا
اور اردو شاعری میں بھی محسوسات کے شعور پر کیفیاتِ حسن کے بیان کرنے کی
لچک اور سکت آئی اسکی ہمواری میں پچیس پچاس برس کا عرصہ کہ وقفہ قوموں
کی تاریخ میں کچھ ایسا زیادہ بھی نہیں ہے۔ جسکا پس منظر آج کا صد سالہ جشنِ غالب"
قومی یکجہتی کے پلیٹ فارم پر ایک کامیاب تحریک ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ فارسی زبان اپنی ترکیب ترکیب پر پُر لطف شیریں زبان ہے
اور اپنی لطافتِ طبع کا ایک سرمایۂ بیش بہا رکھتی ہے اور غالب نے عبد الصمد کی

شاگردی جو عالمِ طفلی میں حاصل کی تھی جس سے غالب کے سادہ دماغ پر وہ اُنس بالفاظ سست
منطبع ہوا جسپر شبعیت کی مدافعت سے وہ رنگ چڑھا اور غالب کو وہ بدطولی حاصل
ہوا جس نے غالب کی جدتِ طبع کے لئے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور یہ فارسی ترکیب
در ترکیب جب شعر کی صورت میں لوگوں کے سامنے آئی تو اُسکی ابتدائی سطح بالکل
ناہموار محض گنجلک تھی۔ غالب کی خوش بختی کہیئے کہ اسکو دو مربّی کراماً کاتبین کی
طرح ایسے میسّر آئے جن کی وقت بے وقت کی ٹوک نے غالب کو سنبھلنے اور مہمل گوئی
کی اغلاق بازی اور دشوار پسندی سے پہلو تہی کرنے کا وہ زرین موقع دیا کہ غالب آج
غالب ہیں۔ میرا روئے سخن مولٰنا فضل حق اور مفتی صدر الدین کی طرف ہے۔ غالب کا
پہلا کلام جو سراسر اپنی ہفت خوانی کے سبب اسقدر سنگلاخ تھا۔ اگر اسکو مہمل بھی
کہہ دیا جائے تو نہ غالب کی روح کو رنجیدہ ہونے کا حق ہے نہ اس سے غالب کی شخصیت
پر کسی بدنما داغ دیکھنے کی نمائش کی جاسکتی ہے اسلئے کہ غالب جن وجوہ پر غالب
کہلائے گئے وہ اُنکی شاعری کی وہ امتیازی خصوصیات ہیں جنہوں نے نصف صدی
بیشتر آنے والے جذبات قومی کا رُخ موڑ دیا۔ جب انگریزی راج میں مسلمانوں کے دماغ
سے سلطنت کی شمع اُمید بھی بجھ گئی اور انگریزی حکمتِ عملی نے فارسی کو سرکاری
دفتری زبان سے بہ یک بینی و دو گوش نکال باہر کیا اور اپنی ایک خاص ڈپلومیسی
پر اُردو کو اُسکی جگہ دے دی تاکہ لوگ خاندانِ مغلیہ کی عظمت اور کارناموں کو
بھول جائیں کم فہم اور کج فہم سمجھتے ہیں کہ انگریزوں کا اُردو پر بڑا بھاری احسان
ہے۔ ڈاکٹر جان گلگرسٹ تو اُردو کا ناخدا تھا۔ اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ تو
اردو کا سنٹر اور مرکزِ اشاعت تھا، یہ بڑا مغالطہ ہے۔ اسوقت اُردو شاعری کو

جس قسم کا تصنع فطرتاً آنا چاہیئے تھا۔ اس نے دو پہلو اختیار کئے۔ ایک کو غالب کا خاص رنگِ امتیاز ہونے کا درجہ حاصل ہوا۔ دوسرے کو اگر لکھنؤ اسکول کا ادبی سرمایہ کہدیا جائے تو زیادہ موزوں ہے۔ اس کو یوں سمجھیئے کہ جب دماغوں نے زمانے کی نئی روشنی میں پرانی مبتذل تشبیہوں سے گریز کرنا چاہا تو لکھنؤ میں جذبات حسن و عشق کو ایک لطیف پیرائے میں بیان کرنے کی بنا پڑی وہاں کی ہر چیز میں یہ حسنِ لطافت ہے بولی میں رہن سہن کے طور و طریقہ میں مگر غالب کا طرز فکر اس سے اور چند قدم آگے تھا جو جذباتِ رومان کو کیفیات میں پیش کر رہا تھا یہ انوکھا انداز غالب کے اپنے وقت میں غالب کا تھا جو اسکی نامقبولیت اور نامسموعیت کا اسوقت باعث رہا۔

اور لکھنؤ میں شاہانِ اودھ کی اور چند یادِ تازہ رہ جاتے سے پرانی شاعری کے لگ بھگ ایک وسطانی شاعری کچھ کیفیات کچھ عریانیت کو لئے ہوئے چلتی رہی غالب کو چھوڑ کر باقی معرکۂ میدانِ شعر دہلی لکھنؤ کا جس مقام پر تھا اسے اس ایک واقعہ سے ملاحظہ کر لیا جائے۔

ع نا تواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا۔ اسپر دہلی لکھنؤ والوں نے مصرعے لگائے دہلی والوں کی حدِ رسائی اور معراج ابلاغ یہ مصرعہ تھی ع ڈال اسپر کفن تو ململ کا لیکن لکھنؤ والوں نے جو مصرعہ لگایا ع ڈال اسپر تو سایہ آنچل کا۔ کیفیات کی عکاسی کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ لیکن پھر بھی مادی حسن کا تعلق باقی ہی رہا۔ اظہارِ جذبات میں کسی آنچل کی ضرورت پھر بھی رہی لیکن غالب نے اپنی ترکیب در ترکیب پرایرانی تہذیب کی پرانی ترتیب کو ایسی ترکیب سے اردو شاعری میں

برتا کہ اُردو شاعری کیفیاتِ حُسن سے معمور ہو گئی جسکی نظیر اُردو شاعری میں نا پیدا
وجود تھی۔ اور آج جو اُردو شاعری میں یہ جھلکیاں آپ محسوس کرتے ہیں یہ غالب
کے معتقد خاص حسرت موہانی کی بدولت اُردو شاعری کے ستھرے سلجھے ہوئے
عام مذاق میں آئی ہیں۔

اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالب کے قبول دوام اور پسند عوام اور شہرت
مدام کا اصلی سبب اُسکا یہ خاص طرزِ انشاء رہا لیکن جب ہم بہ نگاہِ تعمق دیکھتے
ہیں تو ہم کو ایک اور ہی حقیقت نظر آتی ہے جسکو ذہنی نفسیاتی طریقے پر
ہی حل کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ غالب کے اس شعر کو سامنے رکھیں :۔

فارسی بیں گر بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ ؎ بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگ من است

بادی النظر میں آپ غالب کی اس سادہ بیانی کو اظہارِ حقیقت پر محمول
کریں گے کہ فارسی کے کلام میں غالب کا جو کمال ہے جیسا کہ خود غالب کہتا ہے وہ
بات اُسکے اُردو کلام میں نہیں ہے مگر امرِ واقعہ یہی ہے کہ یہ محض غالب کی اک بر خود
غلط اندیشی تھی جسکا خود اُنھیں اعتراف بعد میں ہو گیا تھا نفس الامر میں
غالب کا اُردو کلام ویسا ہی بلند مرتبہ اور ارفع ہے جیسا کہ لوگ خیال کرتے ہیں
اور غالب فارسی میں صائب کے خوشہ چین نہ سہی خاکہ کش ضرور ہیں حقیقت
میں غالب فارسی شاعری میں جس انفرادی مقام کے مالک ہیں اُنکی یہ اُردو
شاعری اُسی کا عکس ہے کوئی مستقل شاعری نہیں ہے بلکہ یہ کہیں عکاسی ہے
کہیں ترجمہ اور کہیں آدھی پونی بجنسہٖ منقولہ جائداد فارسی شاعری کی ہے اسپر
بھی ہم جو غالب کے اسقدر مداح نظر آتے ہیں اور اُردو شعرستان کا مسلم النبوت

اُستاد مانتے ہیں تو وہ کیا حقائق ہیں جو اسکا پسِ منظر ہو سکے ہونگے پس اس حقیقت اور اس واقعیت کو مبرہن ملاحظہ فرمایئے جسکو اکثر اہلِ علم آجتک بھی ایک دھند لکے ہی میں دیکھتے رہے۔

غالبؔ کو غالب جن وجوہ پر کہا گیا ہے وہ اُسکی فارسی شاعری تو کیا ہوتی خود اُردو شاعری بھی نہیں ہے جسکے متعلق سطور بالا میں کہا گیا ہے کہ وہ عکاسی یا ترجمہ یا منقولہ جائداد فارسی شاعری کی ہے۔ درجنوں اشعار آپ کو ایسے ملیں گے جن میں تھا کی جگہ بود رکھ دیا جائے تو شعر فارسی دیوان کا ہو جائے۔

بلکہ غیر ارادی اور لاشعوری طور پر غالبؔ کو شہرت دلانے والی اُسکی وہ نثری شاعری ہے جسکے سبب غالبؔ صاحبِ طرز "موجدِ فن" مانے گئے اور اس طرز کے بابائے آدم بھی یہی ہیں اور صورِ اسرافیل پھونکنے والے خاتم بھی یہی ہیں۔ غالبؔ ہی اُردو زبان کے وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے وقت اور ایسے ماحول میں کہ ہم یہ کسی طرح باور نہیں کر سکتے کہ غالبؔ اس طرز میں کسی کے خوشہ چیں ہوں اپنا ادبی مقام قائم رکھا۔

غالبؔ اپنے اس ادبی دور میں ایسے ماحول سے گذر رہے تھے کہ جہاں اک معمولی سی بات کو ادا کرنے کے لیئے اک طومار تمہید کا ہونا لازمی تھا خوشامد اور تملق کے دستوں پر دستے ہوتے ضرور تھے بسطروں کی سطریں اسی تصنع آمیزی میں صرف ہو جاتی تھیں۔ آخر میں اصل مضمون مطلب کی ادائی ادھوری رہتی کہیں زورِ قلم باندھ دے بیٹھتا کہیں وقت مساعدت نہ کرتا اور کہیں شرم و حیا ادائے اظہار میں مانع آتی یہ کچھ بھی نہوتا تو پھر بساطِ قرطاس اپنی تنگ دامنی کا

رونا روتی۔ ہاتھ لکھنے سے روک دیتی ہے۔ اس طور بازی کا بایکاٹ کر کے تو لا بھی وہ واحد مجاہد تھا جو اپنی خاص طرز انشاء کا موجد اور اپنی مخصوص نثر نگاری کا ناخدا تھا۔ غالب اُس طرۂ امتیاز کا بجا مستحق ہے جو آج اُسکی ایرانی ترکمانی کلاہ کی زینت ہے۔ غرضکہ غالب جب نثر نویسی یا خطوط لکھنے پر آتے ہیں تو وہ موتی بکھیرتے ہیں جنکی چکاچوند سے شش جہت آئینہ ہو جائے جسکا تتبع ہر کس و ناکس کے بس کا نہیں۔ غالب کو خدائے تعالیٰ نے وہ انوکھا انداز بیان بخشا تھا جو دوسروں کے لئے آج تک یکسر سہل ممتنع رہا اسکے کلام کی سب سے بڑی خوبی محاسن یہ ہے اسکی عبارت کے چند جملے پڑھ لینے کے بعد ایسی آئینہ کاری ہو جاتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے ہم غالب کے کلام کو پڑھ نہیں رہے ہیں بلکہ سُن رہے ہیں اُردو زبان میں غالب کے اس معجزے نے وہ اقتدار حاصل کیا کہ لوگوں نے جب اسکا لوہا مانا تو وہ چیز جو اصل سبب تھی اور جسمیں کوئی اسکی پیروی بھی نہ کر سکا وہ تو اوجھل ہو گئی اور دماغوں نے عقیدت کی بھول بھلیاں میں اُلجھ کر حسب دستور وقت اور رواج اسکی اُردو شاعری کے گیت گانے شروع کر دیئے۔ کلام سمجھ میں آئے کہ نہ آئے۔ غالب کی اُردو کی چند غزلیں چھوڑ کر اکثر کا اغلاق تا بہ اینجا رسید کہ اچھے اچھے پڑھے لکھوں نے متعدد شرحوں کی مدد سے بمشکل قبضایا ہے۔ وہیں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اسکا پاکٹ ایڈیشن مطبوعہ برلن ہر انگلش خواں کی جیب میں حمائل در گلو کی عقیدت لیئے ہوئے رہتا ہے اب یہ خدا ہی جانے کہ وہ اسے صحیفہ عقیدت سمجھکر پڑھتے رہے یا کچھ سمجھتے بھی تھے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ضرور غالب کے کلام میں کوئی ایسی نامعلوم کشش ہے

کہ باوجود نامانوس ترکیبوں کی اُلجھنوں کے یہ پسند خاطر خواص و عوام بنا ہوا ہے یہ کوئی سحر آمیزی جب نہیں ہے تو اس پسندیدگی کا سائینٹفک تجزیہ کیا جائے تو یہی چیز سامنے آتی ہے کہ غالب نے اپنے طرز خاص میں جو سہل ممتنع نثری شاعری کی ہے وہ ایسی بدیع الخیالی ہے کہ اسکا تسلط قوم کے سپوتوں کے ذہنوں پر بھوت بنکر سوار ہے اور نثر کے میدانوں میں اُسکی سنگلاخی پر یہ سواری ہر کس و ناکس کا کام نہیں اسلئے لوگ غیر ارادی طور پر اُسکا عکس غالب کی اُردو شاعری میں تلاش کرتے ہیں۔ اور اُس کی نثر کی یہ حُسنِ عقیدت اصلیت پر پردہ ڈالے رہتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ نیک نامی کا تمغہ حاصل کر لینے کے بعد بہت سی فطری فروگذاشتیں فطرتاً لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جایا کرتی ہیں لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں بقول رومی ع کے بودے شیر مسکہ کے بودے پیر پیر۔ کہ غالب لے استاذ کا کوئی استاد نہیں تو غالب مسلم الثبوت استاد نہیں۔

غالب اُردو شاعری کا بھی وہ نہ مٹنے والا چہرہ ہے جس پر اردو شاعری کو بجا فخر و ناز ہے گو ہم غالب کے اُردو دیوان کو جس کو ہم غالب کی شخصیت کے سامنے "دیوان زادہ" کہہ سکتے ہیں نہ کہ دیوان اُسکی غزلوں کی اگر عدم کثرت اپنی کوتاہ دامنی کی قلت پر ہمیں مطمئن نہ کر سکے تب بھی اُسکی جدتیں ہمارے لئے شاعری کے تنوع پر جو بے شمار راہیں کھول دینے میں ہماری رہبری کرتی ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ غالب کا بھی ایک ضخیم دیوان ذوق کی طرح کا ہوتا اور اپنے عام مذاق کی بدذوقی پر تلخ نامی کا باعث رہتا ـــــ تاہم غالب کے اس دیوان زادے میں جس کو اگر دیباچہ شعری بھی کہیں تو موزوں ہو ہم کو ایسے اشعار بھی

نظر آتے ہیں جو غالب کی شخصیت کا احترام ہم سے زبردستی کرا لیتے ہیں یعنی غالب کے چھوٹی بحروں کے وہ اردو اشعار جن میں کوئی فارسی ترکیب کی بھی شرکت نہیں مثلاً ؎ موت کا ایک دن مقرر ہے ؛ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی ؛ اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد ؛ پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب ؛ شرم تم کو مگر نہیں آتی

یہ طرزِ بیان غالب کی جس قادر الکلامی کو بتلاتا ہے اس سے ہم یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہیں کہ غالب اس طرز میں بھی مردِ میدان ہے مگر اپنے طبعی میلان اور فطری رجحان سے مجبور فارسی ترکیبوں کا دلدادہ ہمارے لئے اپنے اشعار کا اگر ذخیرہ انبار کی صورت میں نہ پیش کرے تو بھی غالب کا ہر شعر ہماری اصناف شاعری کے لئے ایک نوبہار ہے جس کو ہم ایک ایک عنوان بھی دیں تو کم ہے۔

اس حقیقت کو ہم ذرا اور سلجھا کر پھر آپکے سامنے پیش کرتے ہیں۔

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو ؛ کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

نواب فصیح الملک حضرت داغ کا ان کے ضخیم چار دیوانوں میں سے جب کبھی کوئی شعر کان میں بیساختہ پڑجاتا ہے وہ یہی شعر وحدہ ہے۔ داغ کی زباندانی، محاورہ بندی اور روزمرہ کی برتائی میں کسے کلام ــــ لیکن اسکے باوجود آجتک نہ کلام داغ کسی جامعہ یونیورسٹی میں اور نہ کسی کالج اسکول میں داخل نصاب ہوا اور نہ کسی مکتب میں داخل درس رہا۔ اور نہ قوالوں نے ہی گایا اور نہ طوائفوں نے ہی طبلہ سارنگی پر بجایا یہ ہے وہ جادوئے بیان جو سر چڑھکر بولے۔

حافظ شیرازی کی طرح، غالب ہی کی غزلوں سے محفل رقص و سرود بھی لطف اندوز ہے اور درس و تدریس کے حلقے بھی بہرہ ور ہیں۔ غالب کی شہرت دوام کی اصل وجہ اسکا بیساختہ پن ہے۔ غالب کا ظرافت آمیز انداز کلام جو اُسکے خلوص اور عدم تصنع کو ظاہر کرتا ہے۔ جبکہ پورا ہندوستانی تمدن بناوٹ اور تصنع کا خوگر دلدادہ نہیں بھی تھا تو بھی افتادہ ضرور تھا۔ غالب کے اس طرز تحریر کو حسکی غالب نے پہل کی سبھوں نے قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا اور اس بیساختہ پن کے لئے جتنی جرأت کی ضرورت تھی وہ اپنے میں نہ پا کر کبھی تقلید غالب پر سر تسلیم خم کر کے عاجز رہے۔ تاہم یہ جھلک بیساختگی کی اُردو ادب میں پیدا ضرور ہو گئی اور کہیں کہیں اسکے نمونے خاصی شگفتگی لئے سامنے آجاتے ہیں۔

جب اس صدی میں انگریزی لٹریچر کا اُردو ادب پر اثر پڑا تو لوگوں کو مختصر نویسی بھی معلوم ہوئی اور اسے نادانی سے تعلیم مغرب کا نتیجہ سمجھ بیٹھے حالانکہ بادنیٰ تامل یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر باہر ہے کہ اسکا موجد مرزا غالب ہے آج بھی لوگ کوشش کرتے ہیں طرز اڑانے کی مگر ہاتھوں کے طوطے اُڑتے ہیں طرز نہیں آتی۔ خدا جانے کیا بات ہے کہ ایک خط میں بھی بڑے سے بڑا ادیب یہ رنگ قائم نہ رکھ سکا ــــ جو غالب نے اپنے پورے کشکول ادب میں برتا ہے۔

ہمارے خیال میں یہ آتا ہے کہ غالب مفکر، مبصر ذہین ہونے کے علاوہ انتہا درجہ کا خوددار دوسروں سے انتہا درجہ کی محبت کرنے والا جب اپنا خلوص پیش کرتا ہے اسکی مراسم یگانگت کے پُراخلاص روابط محرمانہ رازدارانہ پڑھنے والے کو مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ اخلاص کی قیمت اخلاص ہی سے دے۔ اسلئے کہ دنیا

تصنع کی گرفت سے آزاد نہیں ہے دلوں میں وہ صفائی نہیں ہے جو کاتب، مکتوب
اور مکتوب الیہ کے درمیان محاکات کا رشتہ قائم کر دے۔ یہ غیر ارادی اجنبیت
جب حائل ہو جاتی ہے تو ضمیر غائب کی مدد سے لوگ خط و کتابت کرتے ہیں قصہ نویسی
کی زبان کا جیسے غلبہ رہتا ہے اسو جہ سے تمہید بڑھ جاتی ہے مطلب پیچ در پیچ عبارت
میں ادا ہوتا ہے۔ چنانچہ پچھلے پچاس سالہ اُردو لٹریچر پر جب نظر ڈالی جائے تو پہلے
پندرہ برس پہلی جنگ عظیم سے پہلے کے اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اُردو کی
دنیا بھی طول طویل قِصّوں داستانوں سے ہٹ کر ناول نویسی پر آگئی تھی جس
میں بجائے تسلسل عبارت کے متکلم مخاطب کے ناموں سے اک گونہ بہیجہ تخاطب پر
کلام پیش کیا جاتا ہے۔ جنگِ عظیم کے بعد جب وقتی ضروریاتِ زمانہ اور بڑھ گئی تھیں
تو ناول نویسی کرنا ول بینی میں بھی عدیم الفرصتی کے سبب ایک زحمت نظر آنے لگی
جسکی جگہ فسانے۔ فسانے نے لے لی۔

افسانہ ناول ہی کی محاکاتی شگفتہ شکل تھی جسمیں ناول کے مواد کو بطور خلاصہ و
اختصار پیش کر دیا جاتا تھا لیکن زمانے کی بڑھتی ہوئی مصروفیتوں نے فسانہ کو بھی
مختصر کرنا شروع کیا اور پڑھنے سے زیادہ واقعات کو دیکھ لینے پر طبائع زیادہ راغب
پائے گئے تو وہ رغبت ڈراما کی شکل میں دنیا کے سامنے آئی اسکا یہ مطلب نہیں کہ یہ
عنصر ادب میں پہلے موجود نہ تھا بلکہ کہنا یہ ہے کہ اسکے علمی پہلو پہلے معرضِ وجود میں
آچکے تھے ایک مرتب صورت شکل میں ــــ لیکن اسکے عملی کرداری پہلو بھی عمل [illegible]
کی مدد سے بروئے کار آنے لگے تو اُسکا کرداری پہلو اک مستقل فن بن گیا جس کو
تہذیب حاضرہ نے اسٹیڈیو کی بہتات پر ایک دوسری ہی شکل میں پیش کر دیکی

عادت بنالی جسکا تعلق ہمارے اُردو ادب سے اتنا قریبی نہیں رہا جتنا کہ مختصر فسانہ نویسی اور ڈرامیٹک ادب سے ہے۔ چنانچہ فسانہ کہ ڈرامہ ایک باب ایک ایکٹ کا بھی وجود میں آیا۔ اگرچہ آج کا ٹیلی ویژن اسکی آخری سرحد ارتقار ہے اور کیسی زبان کے حد ادب کی گو ارتقا نہیں کہی جا سکتی ہے۔ مگر تمدن کی ضروریات کے تقاضے بہر حال اسکے موجد ہیں۔ یہ چیز اگر آپ ذہن و عین ملاحظہ کرنا چاہیں تو اب سے ایک صدی پہلے میں غالب مرحوم کے کلام کو پڑھیے تو سو فیصد یہ ادبی ارتقا کا حسنِ منظر آپ کو غالب کی اُردو نثر کی ڈرامیٹک بلیٹھک میں مل جائے گا۔

.. یہی غالب جب لوگوں پر تبصرہ تقریظ دیباچہ لکھتے ہیں تو یہ اپنے ہم عصروں کا ایک فرد نظر آتے ہیں وہی مسجع مقفی عبارات میں لوگوں کی خواہش پوری کر دیتے ہیں اور جب اپنے احباب کو نجی خطوط لکھتے ہیں یہی غالب پھر اپنے اصلی رنگ میں نظر آتے ہیں۔ اس فرق کی بھی یہی وجہ ہے کہ غالب اس میں بھی بناوٹ کے الزام سے بری ہیں بلکہ اُن کا معمول وہ "تکلم الناس علےٰ قدرِ عقولہم" لوگوں سے انکی سمجھ کے مطابق بات کرو۔ تو یہاں غالب ان سے اُن کی دِلی خواہش پر ان کو خوش کرنے کے لئے کہ لوگ تصنع پسند تھے مسجع طرزِ تحریر رکھتے ہیں اور یہ رعایت یہاں تک ملحوظ خاطر رہتی ہے کہ غالب جب اپنے خط میں تقریظ لکھتے ہیں تو تقریظی حصہ پُر از مسجع رہتا ہے اور باقی حصہ خط کا اُردو ادب کے شہ پاروں سے لبریز رہتا ہے۔

دوسروں سے غالب کی تقلید اسوجہ سے بھی نہیں ہو سکی کہ غالب نے اپنا سب کچھ کھو کر اپنی آزاد منشی کو باقی رکھا تھا یہ جس سے خط و کتابت کرتے اسکو اپنا ہمراز خاص سمجھکر بے تکلفی سے اس طریقہ پر لکھتے کہ گو یا وہ سامنے ہے اور یہ اس سے

بیٹھے باتیں کرتے ہیں۔

غالب کا جوئے میں ہارتے ہارتے قرضہ لیتے لیتے ڈگری ہو کر قید ہو جانا خود
اس بات کی دلیل ہے کہ لوگ اسکی خودداری سے سہمے رہتے اور ڈر کر اسکی ذرہ بھی ہمدردی
بھی نہ کر پائے ورنہ بنیئے کی وہ کونسی بڑی بھاری رقم تھی جو غالب کے احباب یا شاگرد
ادا نہ کر سکے آخر بعد کو وہ رقم ادا کر کے اسکو چھوڑایا انہوں نے اس قید و بند کی نوبت
ہی کیوں آنے دی۔ مزید وضاحت اس سے پیشتر کی جا چکی ہے کہ غالب کے علمی تفوق
کے جرم کی یہ حاسدانہ سزا تھی کہ بنیئے کو بہکا کر آمادہ کر لیا تھا اس میں کوتوال سے
وقتی سہولتیں اور بہم پہنچ گئی تھیں۔

چنانچہ غالب کی چھ ماہ کی قید اور تین ماہ پر واپس آجانا ادھر کوتوال کی سازش
پر جوئے کے الزام کو سبب قید بتانا ادھر قرضہ کی ڈگری چونکہ واقعہ ایک ہے جو مختلف
انداز بیان میں آ گیا تطبیق یہی ہے کہ کوتوال کی سازش دشمنی بھی مسلّم اور جوا
بھی مسلّم اور بنیئے کا قرضہ بھی تسلیم تو صورت حال یہی رہی کہ لوگ تو جوئے میں ہارتے
ہارتے گھر بار بیوی کو بھی ہرا دیتے ہیں۔ دروپدی کو آخر ہرایا گیا تھا۔ یہاں یہ رہا کہ ہارتے
رہے۔ قرضہ بنیئے کا بڑھتا رہا یہ ڈگری کی قید اک قسم کی نظر بندی جسکا خرچہ مدعی قرض
خواہ کو دینا پڑتا ہے تین ماہ کے بعد یا پھر انہیں یا غالب کے احباب نے چکا دیا یا غالب
کو نیچا دکھا کر دعویداری سے لادعوی پر رہائی ہوئی گویا ڈگری کا سبب قرضہ اور
قرضہ کی وجہ جوئے میں ہار یہ تو ممکن ہے۔ ورنہ جوئے میں قید نری غیر معقول ہے۔

نیز دوسری وجہ کلام غالب کے مقبول عام ہونے کی بھی ملاحظہ ہو۔ —
یہ بتلایا جا چکا ہے کہ غالب نے اصل اقتباس اپنی نثر نگاری میں [illegible]

پیدا کیا تھا۔ دوسرے شعراء جس طرز کی شاعری کرتے تھے اُس کے بالمقابل غالب کا میدان شعر فارسی تراکیب پر مشتمل تھا جو کیفیاتِ حُسن کو بیان کرنے میں زیادہ موزوں مؤثر ہی نہیں بلکہ وسعتِ معنی اور پہنائی خیال جسقدر ان تراکیب کے ذریعہ غالب کی جدت ادائی سے اُردو شاعری میں آیا وہ اک مستقل فن اُردو شاعری میں بن گیا۔ اِس طرز کو حسرتؔ موہانی نے غالبؔ کے تتبع میں معقول حد تک پسندِ خاطرِ عوام و خواص بنوا دیا چنانچہ وہ ترکیبیں جو حسرتؔ کے یہاں اپنے ہم عصر شاعروں کے خلاف نظر آتی ہیں۔ یہ نوادر تراکیب اضافی کلامِ حسرتؔ، غالبؔ کے طرز ایجاد کا ہی نتیجہ ہیں جو بلاشبہ کہ آج اُردو شاعری کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ اس میں کچھ بھی کلام نہیں کہ اگر یہ ترکیبیں اردو شاعری سے نکال دی جائیں تو اردو شاعری کا افلاس محتاجِ بیان نہ رہے۔

یہ چند ترکیبیں حسرتؔ کی ملاحظہ ہوں:۔ رنگِ اثرِ شیرینیٔ نسیم۔ تہذیبِ رسمِ عاشقی۔ اعتبارِ شانِ رسوائی۔ قانعِ رنج۔ جیلی کی مشقتِ دامِ محنت۔ رسوائی جہانِ آرزو۔ مزاجِ لاابالی۔ ممنونِ تمنا۔ تاجِ فرقِ عزم۔ سوغاتِ عشق۔ نگہِ بدگمان۔ شوقِ لرزاں۔ پرسشِ جرمِ عشق۔ نازشِ حاصلِ تمنا۔ حاصلِ دیوانِ تمنا۔ جانِ تمنا۔ جانانِ تمنا۔ شوقِ پیمانۂ طلب۔ سستیٔ پیمان۔ آوارگیٔ بادِ صبا۔ مجبورِ حیا۔ کرمِ جور نما۔ جانِ دوا۔ قسمتِ غم۔ پابندِ بلا۔ اعتبارِ جنوں۔ عقلِ صبر آزما۔ ہمہ تگِ ناز۔ آگاہِ رعنائی۔ آغازِ شرارتِ التماسِ عذر۔ تمہیدِ شکایت۔ حسنِ جفاکار۔ ہم شکلِ عتاب۔ عقدہائے شوق۔ ترجمانِ شوق۔ بارِ انتظار۔ لیل و نہارِ انتظار۔ مجروحِ الم۔ نگارِ انتظار۔ رنجِ بےشمارِ انتظار۔ شرمسارِ انتظار۔ روزگارِ انتظار۔ کاروبارِ انتظار۔ غرقِ شادی

سیرابِ نشاط - جہانِ آرزو - سازِ حسرت - دل عشرت نصیب - سیلاب
نشاط - جانِ آرزو - حرمانِ الم - رائگانِ اضطراب - زبانِ اضطراب -
نفرتِ ناز - شکارِ نیم جان - بادبانِ اضطراب - آبروئے فراق - ہائے ہوئے
فراق - گدازِ طبیعت - فراغتِ حیرت - مایوسِ مرحبا - راحتِ جانِ عاشقاں
آسائشِ بقا - دشمنِ وفا - خندہ زخمِ دل کشا - حسرت کشانِ بادہ ---
پائمالِ اشتیاق - رنجِ اثر - طلبِ مصلحتِ عام - لذتِ کشمکشِ دوام -
بیکسی ہائے عاشقی - مایۂ عشرتِ بیحد - غمِ قیدِ وفا - شانِ توجہ - آئینِ
اشتیاق - اشتباہِ التفات - ہلاکِ آرزو - رونقِ کاشانہ - ورائے ناز -
آرزوہائے کامیاب - سرخوشی ہائے بیحساب - جامۂ زیبی - طلبگار دوا -
برق لرزاں - حسنِ سحر پرور - راہ و رسمِ ہوشیاری - حسنِ حیا پرور - سعی
نارسائیِ خیالات - (یعنی عذر لنگ) - اقرارِ آساں - اصرارِ مضطر - دودِ ہوش
کوشِ باطل - رضا شیوہ - عشاقِ ستم کش - شہیدِ فرقتِ گل - بلبلشِ
زبانِ عاشقی - تعلیمِ نادانی وقس علیٰ ہٰذا ---- یہ چند ترکیبیں کلامِ حسرت کی
آپکے سامنے موجود ہیں ان کو ذہن میں رکھیئے اور غالب کے دیوان کو شروع سے
آخر تک پڑھ جایئے - آپ کے سامنے جو انوکھی ترکیبیں فارسی در فارسی کی غالب
کے کلام میں آئیں گی اسکے مطالعہ سے آپ زمینِ شعر کی نئی کاشت، نئی پود کے
متعلق جو معلومات فراہم کریں گے وہ انہی روشنی میں ہوں گے کہ مذکورہ بالا
حسرت کی ترکیبیں، غالب کی ترکیبوں کا عکسِ اولین ہیں - بلکہ حسرت نے
ان کو غالب سے تلمیذانہ عقیدت مندی میں ع نقاشِ نقشِ ثانی بہتر کشد ز اول

غالبؔ کی ترکیبوں کو اپناتے ہوئے کچھ سلجھاؤ کیسا تھ یہ رنگ پیش کیا ہے جس سے اوروں کو بھی حسب استعداد و صلاحیت یہ قدرت استعمال میسر آئی۔ نیز اس ترکیب کے پس منظر پر بھی غور فرمایئے کہ "چکی کی مشقت" پورا مصرعہ یہ ہے۔

ع ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی!!

حصول آزادی کی خاطر زندگی کا بڑا حصہ مولنٰا فضل الحسن حسرتؔ موہانی نے اسیریٔ فرنگ میں گزار دیا سب سے زیادہ ہندو مسلم مجاہدین میں حسرتؔ موہانی کا حصہ جیل میں گذرا اور ظاہر ہے کہ قید با مشقت سیاسی نظر بند شخصیتوں کو نہیں ہوتی مگر یہ انگریزوں کا ہی اخلاق تھا ورنہ اس نظر بندی میں نہ کپڑے قیدیوں کے ہوتے ہیں نہ کھانا نہ محنت یہ ایک قسم کی پبلک سے علیحدگی ہوتی ہے کہ اسیر یہ اثر نہ ڈالیں نہ پڑے ان کے خیال میں۔ غرضکہ آپ نے کلام حسرتؔ کی ترکیبیں ملاحظہ کیں اب آپ کلام غالبؔ کی تراکیب بھی ملاحظہ فرمائیں اور موازنہ کر دیکھیں کہ فنی عقیدت نے اردو شاعری کو چار چاند لگانے کے لئے غالبؔ کے اس رنگ خاص کا کس طرح تجربہ اپنے کلام میں اُتارا ہے۔ چونکہ ہم اشعار کی تشریح میں ان تراکیب کی ساخت اور کیفیت پر سیر حاصل بحث خدا چاہے آئندہ کریں گے۔ اسلئے مشتے نمونہ از خروارے۔

مخصوص تراکیب غالبؔ ملاحظہ ہوں :—

نقش فریادی۔ شوخیٔ تحریر۔ سخت جانیہائے تنہائی۔ جذبۂ بے اختیار شوق۔ سینۂ شمشیر۔ آگہی دام شنیدن۔ عالم تقریر۔ آتش زیرپا۔ غمخوار جان دردمند۔ تنگیٔ چشم حسود۔ مکتب غم دل۔ داغ عیوب برہنگی۔ ننگ وجود۔ سرگشتۂ خمار رسوم و قیود۔

دوستدارِ دشمن ۔ اعتمادِ دل ۔ جرأت آزما ۔ شور پندِ ناصح ۔ آتشِ خاموش
جوہرِ اندیشہ ۔ طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا ۔ رقیبِ سرو ساماں ۔ مائدۂ لذّتِ درد ۔
آموزِ فنا ۔ ہمّتِ دشوار پسند ۔ بابِ نبرد ۔ عشقِ نبرد ۔ طلبگارِ مرد ۔
تالیفِ نسخہائے وفا ۔ مجموعۂ خیال ۔ چارہ سازیِ وحشت ۔ مرغوبِ بتِ
مشکل پسند ۔ تماشائے بیک کف ۔ بردنِ صد دل ۔ فیضِ بیدلی ۔ نومیدیِ
جاوید ۔ اندازِ بخونِ غلطیدنِ بسمل ۔ نقشِ وفا ۔ وجہِ تسلّی ۔ شرمندۂ
معنی ۔ حریفِ دمِ افعی ۔ حریفِ دمِ عیسیٰ ۔ گذرگاہِ خیال ۔ خیالِ مے و ساغر
جادۂ سر ۔ منزلِ تقویٰ ۔ منّت کشِ گلبانگِ تسلّی ۔ صدمۂ یک جنبشِ لب ۔
گلدستۂ طاقِ نسیاں ۔ بیدادِ کاوشہائے مژگاں ۔ تخمِ سرو چراغاں ۔
خونِ گرمِ دہقاں ۔ برقِ خرمن ۔ تماشائے ویرانی ۔ پرتوِ نقشِ خیالِ یار ۔
تبسّم ہائے پنہاں ۔ حجرۂ زندانِ یوسف ۔ جادۂ راہِ فنا ۔ اجزائے پریشانِ
بیابانِ ماندگی ۔ حبابِ موجۂ رفتار ۔ موجِ بوئے گل ۔ سراپائے رہنِ عشق ۔
ناگزیرِ الفتِ ہستی ۔ خمارِ تشنہ کامی ۔ خمیازۂ ساحل ۔ نواہائے راز ۔ رنگِ
شکستہ ۔ گرہِ نیم باز ۔ تاراجِ کاوش ۔ خیالِ حسن ۔ دیدۂ اختر ۔ گنبدِ بے در ۔
برقِ سوزِ دل ۔ زہرۂ ابر ۔ کفِ سیلاب ۔ تارِ نگاہ ۔ دیوارِ جو ۔ شمعِ بزمِ بیخودی
بساطِ صحبتِ احباب ۔ موجِ رنگ ۔ اندازِ اثر ۔ نازشِ ایام ۔ پہلوئے اندیشہ ۔
جنونِ نارسا ۔ سیلِ گریہ ۔ ماتمِ یک شہرِ آرزو ۔ دشتِ وفا ۔ عیدِ نظارہ
(با عافیت و بیک اضافت) داغِ تمنا ۔ موجِ سراب ۔ زخمِ تمنا ۔ خمارِ شوق ۔
شیرازۂ دشت ۔ یادگارِ نالہ ۔ رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن ۔ مرہونِ حنا ۔

اوراق لختِ دل۔ گرفتارِ وفا۔ قحطِ غمِ الفت۔ تیر نیم کش۔ رگِ سنگ۔ تجاہلِ پیشگی۔ فروغِ شعلۂ حسن۔ پاسِ ناموسِ وفا۔ موجِ محیطِ بیخودی۔ دماغِ عطرِ پیراہن۔ غمِ آوارگی۔ دلِ ہر قطرہ۔ شہیدانِ نگہ۔ غارت گر جنسِ وفا۔ شکیبِ خاطرِ عاشق۔ وعدۂ صبر آزما۔ فتنۂ طاقت ربا۔ نازشِ ہمتائی۔ پئے نظر کرم۔ شرمِ نارسائی۔ زکوٰۃِ حسن۔ تمنائے زبان۔ سپاسِ بے زبانی۔ شکوۂ بے دست و پائی۔ حسرتِ سنج۔ تسلیمِ ضبط۔ نذرِ امتحانِ اعتبارِ عشق۔ عجزِ حوصلہ۔ خندہائے گل۔ تشنۂ فکرِ سخن۔ موجِ نگہ۔ بساطِ نشاطِ دل۔ نبضِ خس۔ تشنۂ فریاد۔ نیرنگِ نظر۔ جراتِ فریاد۔ حاصلِ الفت داغِ حسرتِ ہستی۔ بندِ نقابِ حسن۔ حاصلِ حسرت۔ حسرتِ حاصل۔ ساغرِ میخانۂ نیرنگ۔ صحرا دستگاہ۔ تنگِ سجدہ۔ سرمۂ مفتِ نظر۔ چشمِ خریدارِ رخصتِ نالہ۔ وہمِ ناز۔ نشانۂ صبا۔ بزمِ قدح۔ عیشِ تمنا۔ دامنِ نگاہ۔ خود دارئ ساحل۔ ہوسِ نکہتِ گل۔ ذوقِ تماشا وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔ غرضیکہ کہاں تک لکھا جائے۔ پورا دیوان بھرا پڑا ہے۔ اس سے آپکو کم از کم اندازِ غالب کا اندازہ ضرور ہو گیا ہوگا کہ ایک ایک ترکیب میں دریا کو کوزہ میں بھر کر بلکہ سمندر کو قطرہ میں سمو کر بتایا گیا ہے جب شرحِ ابیات ملاحظہ فرمائینگے تو معلوم ہوگا کہ واقعی ان تراکیب کی بدولت غالب نے جو اردو شاعری کو موت کے گھاٹ سے بچایا یہ احسان غالب کا اُردو شاعری اور ادب پر ایسا ہے کہ آج محفلِ مشاعرہ کے لطف پر لطف ہم اُٹھا رہے ہیں اور ہمارا سرمایۂ ادب لاثانی لامحدود بساطِ شعر پر ہمارا ہمنوا ہے۔ اکثر ترکیبوں کے رنگِ اثر اور طرزِ ایجاد نے خود کلامِ غالب میں ہی اپنی پہنائی حدود کو

پیش کر کے بتایا ہے جسکا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ یہ تراکیب اضافی تین قسم کی ہیں ایک ترکیب والی۔ ۲ دو ترکیب کی اور ۳ سہ ترکیب والی۔ ان میں جو ایک ترکیب کی ہیں ان میں بھی مضاف اور مضاف الیہ کے الٹ پھیر سے مزید ۲ دو رنگ پیدا ہو جاتے ہیں ان کی شیرینی اور ملاحت فصاحت سے گزر کر بحد بلاغت پہنچی ہے۔ جیسے حاصلِ حسرت اور حسرتِ حاصل کی ترکیب اسکا شیبوع آٹے میں نمک کی حلاوت جیسی ملاحت لئے ہوئے ہے۔ کہیں مضاف اہم ہے اور متعدد مضاف الیہ اپنے منسوب الیہ بنا رہا ہے۔ جیسے موج کہ یہ موج رنگ۔ موج اثر۔ موج خیال۔ اور ہزاروں موجوں کے تموج کو اُردو ادب کا سرمایۂ حیات بنا رہی ہے۔ اور کہیں مضاف الیہ پر ایسے ہی ہزاروں مضاف بساط ادب اُردو کے فرش کو عرش تمثال بنا رہے ہیں۔ جیسے زخم تمنا۔ حاصل تمنا۔ داغ تمنا۔ موج تمنا۔ ذوق تمنا۔ جان تمنا۔ یہ اک بنیادی تجزیہ ہے اور اُردو زبان و ادب اور اسکی شاعری نے اسے بدرجۂ اتم بحُسن قبول بکثرت اپنایا ہے۔ یہ اضافہ اس اضافت کا ادب میں اولیت کا درجہ رکھتا ہے۔ دوسرے درجہ کی دہری اضافت ہے وہ بھی کہیں تو پہلے درجہ کی اضافت سے بھی اونچے مقام بلاغت پر ہے اور کہیں برابر اور اکثر مقامات پر دوسرے درجہ پر تو اُسکا مقام ہے ہی۔ مثالیں ملاحظہ ہوں :- قحط غم الفت۔ موج بوئے گُل۔ تنگیٔ چشم حسود۔ مکتب غم دل۔ وغیرہ۔

اُونچے درجہ کی مثالیں :- برقِ سوزِ دل۔ ذوق ساز عشق۔ شور پندِ ناصح۔ خونِ گرم دہقان۔ ضبط آہ غم۔ شمع بزم عرفاں۔ آتشِ زیر پا۔ سوز ضبطِ پنہاں۔ فکر روز جزا۔ فرط حزن یاس وغیرہ ایسی دہری ترکیبیں

جن کی بندش غنائیت لئے ہوئے ہو وہ سب سے اونچے درجہ میں اسلئے ہیں کہ باوجود
اردو زمین پر عدم مساعدت کے وہ بار خاطر نہ ہوتے ہوئے ترنم اور موسیقیت اور
جامعیت کی حامل ہیں۔ اس دُہری اضافت کو اردو ادب کے نثری سرمایۂ تمدن سے
زیادہ شعرستانِ اردو نے اپنایا ہے جہاں پہلی قسم اکہری اضافت والی نظم و نثر
ہر دو میں برابر اپنے حسنِ استعمال کے نمونے پیش کرتی رہی ہے وہاں یہ دہری اضافت بھی اپنے
معیارِ بلاغت پر پوری اُتری ہے مگر صرف دنیائے شعر میں، زیادہ نثری ادب میں کم۔
دوسرے درجہ کی دہری ترکیبیں :۔ مثالیں ملاحظہ ہوں :۔ اوراقِ
لختِ دل۔ داغِ حسرتِ ہستی۔ شمعِ بزمِ بیخودی۔ موجِ محیطِ بیخودی۔ فروغِ
شعلۂ حسن۔ حبابِ موجۂ رفتار۔ پاسِ ناموسِ وفا۔ بساطِ نشاطِ دل۔ تشنۂ
فکرِ سخن۔ حریفِ دمِ افعی۔ حریفِ دمِ عیسیٰ۔ تخمِ سروِ چراغاں۔ گلدستۂ طاقِ
نسیاں۔ وغیرہ وغیرہ جن کی ادائی اک سلاست لئے ہوئے ہو یہ بھی زیادہ تر
اشعار ہی میں مستعمل ہیں اور فصاحت کو حامل ہیں۔ اور اس قسم کی ترکیبیں
بھی اسی میں شامل ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں :۔ رقیبِ سر و سامان۔ خیالِ
مئے و ساغر۔ خمارِ رسم و قیود۔ وعدۂ صبر آزما۔ شکوۂ بے دست و پائی۔ فتنۂ طاقت ربا۔
چارہ سازیِ وحشت۔ ہمتِ دشوار پسند۔ غمخوارِ جانِ دردمند۔ وغیرہ۔
تیسرے درجہ کی دُہری ترکیبیں :۔ وہ سب ہیں جو شعر کی تقطیع پر بسہولت
پوری اتریں اور اُن میں کوئی ادبی سقم زبان و قواعد کا نہ ہو جیسے سراپائے رہنِ
عشق۔ دماغِ عطرِ پیراہن۔ غمِ آوارگیہائے صبا۔ داغِ عیوبِ برہنگی۔ حجرۂ
زندانِ یوسف۔ بیدادِ کاوشہائے مژگاں۔ منت کشِ گلبانگِ تسلی۔ مائدہ

لذتِ درد۔ جذبۂ بے اختیار شوق۔ ہوس نکہتِ گل۔ ساغرِ میخانۂ نیرنگ۔ غارت گرِ جنسِ وفا۔ صدمۂ یک جنبشِ لب۔ تالیفِ نسخہائے وفا۔ ماتمِ یک شہرِ آرزو۔ وغیرہ اور اس قسم کی تراکیب بھی اسی قسم میں آتی ہیں۔ مرغوبِ بتِ مشکل پسند۔ خندۂ زخمِ دل کشا۔ عرصۂ لیل و نہارِ انتظار۔ نذرِ دل فریبیِ عنوان۔ پرتوِ خورشیدِ جہانتاب" باقی ۳ ترکیبی اضافتوں کی بحد جواز بساطِ اردو وہاں متحمل ہو سکی ہے جہاں یہ حدِ فصاحت پر پوری اتریں تو وہ انکے موقعہ محل کا فیضِ صحبت ہے۔ ان کا زیادہ تر حصہ وہی طرزِ بیدل کا بقیۂ متروکہ ہے عربی ادب میں اس قسم کے تکرار کو مخلِ فصاحت بتایا ہے یعنی یہی ۳ ترکیبی یا زیادہ کی نثر میں ہو تو وہی سودا کی نثر کہلائے "ضمیرِ منیر پر آئینہ دارانِ معنی کے مبرہن ہو" باقی جن کو جواز میسر ہے وہ شدستان کا میدان ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:۔ خوں شدہ کشمکشِ حسرتِ دیدار۔ پرتوِ نقشِ خیالِ یار۔ رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن۔ حسنِ فروغِ شمعِ سخن۔ شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر۔ طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا۔ نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں۔ نازشِ ایامِ خاکستر نشینی۔ گذرگاہِ خیالِ مے و ساغر۔ اصلِ شہود و شاہد و مشہود وغیرہ اور اس قسم کی باقی جملہ تراکیب ۳ ترکیبی اور زیادہ کے انداز کی جیسے بطوفان گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی۔ اور فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن وغیرہ۔ **الغرض** یہ تراکیب اضافی کا سرمایۂ ادب جو غالب نے اردو شاعری کو بخشا ہے جسکے سبب ہم کائنات اردو ادب میں اس خاص ادبی مقام کی نشاندہی کرتی ہے جس سے آج دوسری زبانوں کی شاعری خالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ارسطو کا قول ہے:۔ "شاعری قدرتی اشیاء کی نقالی ہے"

یعنی محاکات اسلئے شاعر کا یہ مقصد ہر گز نہ ہونا چاہیئے کہ محض واقعات کو ہو بہو بلاکم وبیش و بلاکم وکیف، بے کیف رنگ آمیزی پیش کردے کہ یہ کام مورخ کا ہے شاعر کا نہیں، بلکہ شاعر کو چاہیئے کہ الفاظ کی دنیائے محدود میں وہ لامحدود وسعت خیال بھردے کہ چشم تخییل جسکو عالم خیال سے بادنیٰ غور و فکر نا محل آئینہ تصور میں محسوس کرسکے۔ خیال انسانی کی قوت متفکرہ اور قدرت مصورہ کی حد نہیں وہ ماورائے عرش ورا الوریٰ بھی دن میں کتنی بار ہو آتا ہے تو جب شاعر اپنی سحر بیانی کی فنکاری سے سادہ روزمرہ کے الفاظ میں یہ جذب محاکات بھردے گا تو اسکا یہ کرشمۂ اعجاز محدود میں لامحدود کو آئینہ کردکھانا ہی "تلمیذ الرحمٰن" کہلاتا ہے اور خود کو مافوق الفطرۃ کا مستحق بتلاتا ہے۔ "آدمی آدمی انتر۔ کیا ہیرا کیا کنکر" کہ سب شعراء اس عرشی تلمذ میں یکساں رتبہ اور متحدہ فضیلت کے ایک جیسی سکت صلاحیت اور استعداد نہیں رکھتے، جو اس سہل ممتنع کے استعمال پر اور اس کے اظہار پر جس قدر قادر ہے اسی قدر نوائے سروش کا ترجمان ہے۔

چنانچہ فلاسفر۔ مصور اور شاعر یہ تین متضاد ہستیاں ہیں مگر جب عنصری اجسام اور فلکی اجرام سے گذر کر اپنی گذرگاہ خیال، رنگ و بو کے عالم سے کہیں اوپر بنالیں۔ تو پھر اس مقام پر یہ ہر ۳ متضاد ہستیاں بلکہ حقائق ایک ہی عرصۂ وحدت میں اپنی حیات شعوری پر گامزن نظر آتی ہیں۔ فلسفہ کا تعلق دماغ سے ہے، مصوری کا نگاہ اور موئے قلم کی دستگاہ سے اور شاعری کا جذبات اور واردات قلبی سے ہے، دماغ کا کام افکار و حوادث کو پیدا کرنا، پھر

مرکزِ خیال سے خزانۂ حافظہ میں جمع کر دینا۔ اور نقاشی کے حدود نوکِ قلم تک محدود تھے مگر قلب کی وہ لامحدود دنیا ہے کہ دل کی خواہش ہمیشہ یہی رہتی ہے کہ اظہارِ جذبات کیے جائے اور دم نہ لے یہ اگر دم لے تو پھر ہمیں دم دینے پر بیدم کر کے ہی دم لے۔ یہ دل ہے جو اپنے رنج اور اپنی خوشی سے دنیا کو برابر حصہ دیتا رہتا ہے نہ بخل کرتا ہے نہ احسان جتاتا ہے اور سبھی کے دُکھ درد میں برابر کا شریک حال ہے۔ جہاں ع: "افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را" ہے وہیں یہ بھی ہے:۔

ع: "گل از نسیم ہست عیاں از نشاط ما۔ یہی وجہ ہے کہ قلبِ انسانی منبع داد و ستد کی وجہ سے فعلیت حقیقی سے استناد اور نسبت رکھتا ہے مسندِ جلال یزدانی کہلاتا ہے اور دماغ تاثرات اور انفعالات کی بھول بھلیاں میں انقباض اسر منی سے بار بر دوش رہتا ہے۔ اور مصوّران ہر دو کے جذبات و خیالات کی عکاسی کو کہیں بحدِ کمال پہنچکر ہی بساطِ قرطاس پر لا سکا ہے۔ بہرحال دماغ سکون چاہتا ہے اور قلب حرکت کا خواہاں ہے۔ تنگیِ دل کا گلہ کیا، غالب کہتا ہے کہ یہ وہ کافر دل ہے کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا تو جس شاعر کے یہاں قلب و دماغ کی ہم آہنگی پر شاعری موسیقی کا روپ دھار کر مصوّری کا وجودِ خارجی پیش کرتی ہے تو پھر وہی شاعر ہے وہی تلمیذ حق ہے اور وہی پھر بقول میر علیہ الرحمۃ:۔

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا ؛ مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کا مستحق ہے۔ یہ ترجمانِ حقیقت جب ترجمانِ قوم بنتا ہے تو قوم اسکی سربلندی پر فخر کرتی ہے۔

یہ امتزاج شاعری مصوّری اور فلاسفی کا بیشتر کی غنائیت کو لیے ہوئے

ہم غالب میں بدرجۂ اتم پاتے ہیں کہ اسکے دماغ کی ہم آہنگی کا واردات قلبی سے وہ اتحاد ہے کہ ہر شعر اُسکا جان موسیقی اور شان مصوری اور کان فلاسفی کی محاکات کا حامل دنیائے ادب کو خود اپنی طرح بیخود بنائے ہوئے ہے۔

پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

یہ وسعت لامتناہی دوسرے شاعروں کے یہاں خواب و خیال ہے اور اسکی وجہ وہی ہے کہ وہاں اِن "اقانیم ثلاثہ" کا وہ اتحاد، امتزاج مفقود و معدوم ہے اور جہاں جتنا ہے اتنا شعور شعری بھی ہے۔

غالبؔ کے تمدنی برکات!

غالبؔ کی زبان و ادب پر اثر اندازی اور خود متاثر ہونا اک امر حقیقت ہے۔ آج کا اردو ادب یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ وہ جسمانی و روحانی طور پر غالبؔ کے طرز طریق سے متاثر اور ہم آہنگ ہی نہیں بلکہ تمام تر عکاسی پورے تاثرات کے ساتھ لئے ہوئے ہے۔ اردو شاعری کی موجودہ لامحدود وسعتوں کی داغ بیل غالبؔ ہی نے اُردو ادب میں رکھی ہے اور یہی اس اردو ادب کی خوش بختی ہے کہ اس بحرِ ذخار کی نہریں جدولیں کونپلیں گلشن ادب کے چپہ چپہ پر لہراتی بل کھاتی نظر آتی ہیں۔ آج کا موجودہ اردو ادب حقیقی معنوں میں غالبؔ کی کاوش نگارش کا ممنونِ احسان اور مرہون منت خاص ہے اگر فارسی تراکیب کی سلاست کی رُخ نمائی غالب نہ کرتا تو آج ہم اپنی اُردو شاعری کے ایک وافر حصّہ سے جو ہمارے سرمایۂ ادب کی روح کہلاتا ہے۔

نا آشنائے محض رہتے۔

اگر غالب اپنی جدت تراکیب سے ہمارے قلب و دماغ کی عنانِ توجہ کو اس لامحدود ذخیرۂ معنی کی طرف نہ منعطف کراتا تو ہم بقین کیساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے مخزنِ ادب میں سوائے چند خزف پاروں کے کوئی صدف ایسا نہ ملتا جسمیں کوئی بے بہا موتی ہو۔

اردو نثر نگاری میں اگرچہ دنیا باوجود کوشش بسیار کے تقلیدِ غالب میں ناکام رہی لیکن یہ کسی طرح کہنا درست نہ ہوگا کہ رنگِ غالب کے اثرات اور اسکے طرزِ ادا کی جھلکیاں بھی اردو ادب میں نہیں پڑیں۔

ہم آج بدانگہ کھلے طور پر محسوس کرتے ہیں کہ ہم گو خطوط نویسی میں غالب جیسے نہیں ہو سکے لیکن ایک اُستاد کے تلمیذوں کو جس نسبت سے فیض استاد پہنچتا ہے وہ آج ہمارے خطوط میں ہماری تحریروں میں نمایاں طور پر موجود ہے کہیں چولہ بدلکر کہیں شکل بدلکر کہیں روپ بدلکر اور کہیں جنم لیکر۔ چنانچہ حسن نظامی کا وجود اپنی تحریروں میں غالب کے سرمایۂ ادب کو بہت سی عکامیوں کے ساتھ پیش کر رہا ہے اور بہت جگہ رُخ رُخ سے یہ اثر اندازی اپنے تنوعات کو بتا رہی ہے۔ سرسید آزاد کا زمانہ چھوڑیئے۔ آج کا ابوالکلام آزاد اور دوسرے انشاء پرداز بھی غالب کے دسترخوانِ ادب سے اندوختہ اندوز ہیں حتیٰ کہ جدید اردو ادب کے نشہ سوار بھی غالب کی بے جا کانہ نثر نگاری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اسلئے یہ کہنا حق بجانب ہے کہ غالب علی کل غالب کے نظم و نثر میں وہ گلشن ادب کا کونسا میوہ ہے جو اس دسترخوان پر نہیں۔ ہاں اسقدر اضافہ یا حاشیہ ضرور چڑھا ہے کہ

مؤمن۔ غالب کے یہاں جو فارسی بندشیں تھی وہ امیر و داغ جوش و حسرت کے یہاں پہنچتے پہنچتے سلجھ کر اسقدر صاف اور شستہ ہو گئی تھیں کہ بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ چیزیں غالب سے انھیں وراثتہً نہ ملی ہوں۔ مگر حقیقت برعکس ہی بنیادی ادبی سرمایہ حیات ان لوگوں کے یہاں بھی من و عن غالب ہی کے یہاں کا ہے۔ کہیں بالواسطہ اور کہیں بلاواسطہ۔ اور اس تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ ہو کہ غالب اپنی انفرادیت کے امام بھی خود، مقتدی بھی خود ہی رہے اور کسی وقتی اثر پذیری سے ہم آہنگ نہ ہوئے۔

غالب اپنے کسی دور میں بھی مغلوب الکیف، مغضوب الحال نہ تھے۔ چنانچہ حصول ملازمت کی طلب میں جب پنیس میں بیٹھ کر صاحب بہادر کی کوٹھی پر گئے اور وہ ملازم کے لئے برائے استقبال باہر نہ آیا تو یہ ع اُلٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا۔ واپس لوٹ آئے یہ کہتے ہوئے کہ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ اس تعلق سے مزید اعزاز میں کچھ اضافہ ہوگا۔ اگر رہا سہا بھی جا رہا ہے تو چلو واپس۔ ایسی خلعت اور ایسی ملازمت سے ہم باز آئے۔ کیا سادگی ہے اور کیا معصومیت ہے اور کیا اصلیت ہے۔ یہ واقعہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں تعصب تصنع کا مادہ مطلق نہ تھا۔ وہ غلط طور پر منفعل ہونا جانتے ہی نہ تھے۔ وہ طبع فعال لیکر پیدا ہوئے تھے کل عمر انگریزوں کی خوشامد میں بسر کی مگر بجز انکی دخت رز سے ناجائز تعلق اور آشنائی کے کسی اور چیز سے جائز کہ ناجائز اثر نہیں لیا۔

غرضیکہ آپ سیرت غالب پر اگر گہری نظر ڈالیں گے تو آپ کو صاف معلوم ہو جائیگا کہ غالب کٹر مسلم تھے۔ فرنگی اثرات میں جو تمدن اسوقت بہہ رہا تھا۔

غالب اُسکے شدت کے ساتھ مخالف تھے جن کو لوگ اپنے جہل اور اپنی نادانی اور حمق سے
انگریزوں کے پٹھو بتاتے ہیں۔ جب جوانی میں سر پہ بال رکھے ڈاڑھی منڈائی تو موٹی
موٹی مونچھیں رکھ کر اس تقلید نصاریٰ کی مٹی پلید کی اور آخر دم تک سردی میں فرغل
معتدل موسم میں کشمیری چغے موسم گرما میں یہی ٹھنڈے آخر دم تک استعمال کرتے رہے

دلّی کی حرارت کی تاب جب بڑھاپے میں نہ رہی تو کُرتا نکال کر برہنہ تہمد کے
ساتھ گذارتے۔ اس پر بھی تعجب ہے کہ انگریزوں کے خوشامدی پٹھو کہلائے اک دُنیا ٹوڈی
تھے کہتی رہی۔ دراصل ایک تو غالب اتفاقاتِ زمانہ، اقتضاءِ وقت کے سبب اپنے
باپ، چچا کے زمانے سے انگریزوں کے نمک خوار پنشن یاب رہے تھے دوسرے غالب ایک
اصولی غیر متعصب انسان تھے ہر مذہب و ملت والوں سے روابط تھے جبکہ دلّی میں
انگریزوں کے سایہ میں سے گذر جانا بھی کفر تھا۔ غالب کے بڑے بڑے انگریز آفیسروں
سے روابط اور گہرے تعلقات اور دوستانہ مراسم تھے لیکن کھانے پینے اوضاع و
اطوار میں نہ تھے۔ برخلاف سر سید اور ان کے متبعین کے کہ جنہوں نے ذہن یا دھارے
مغربیت کے تمدن پر وار کے ڈالے یا خود اس تمدن نے انہیں آغوشِ مادر سے سوا لطف
و رحمت بخشا کہ وہ بالآخر مغربیت زدہ ہو کر رہ گئے۔ غالب صرف انگریزوں کے مداح
بظاہر اصول پرستی کی حد تک رہے۔ اور سطحی طور پر اتنی ہمنوائی آج کبھی نگاہِ حق سے
دیکھا جائے تو کرنا پڑتی ہے۔ غالب کی معتدل روش بہ نسبت دوسروں کے ایسا غنیمت تھی۔

آج دنیا کا بیشتر حصہ برٹش تمدن کے زیر اثر ہے عرب ہو کہ عجم خود روس کہ جو حریف
ازلی ہے وہ بھی اسی تمدن کا شکار ہے اُسکے بالمقابل غالب جتنا انگریزوں میں گھلے ملے
تھے یہ تقریب اگر سید کو میسر آتا تو جہاں اُنہوں نے انگریزوں کو خوش رکھنے کے لیے

حسبِ مزاجِ افرنگ تفسیرِ قرآن لکھ ڈالی اگر بس چلتا تو شاید کوئی دوسرا قرآن ہی لکھ ڈالتے۔

اگر سرسید خدا کو یہ جواب دیکر چھٹکارہ پالیں گے کہ میں اے خدا! حالی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں تو کیا حالی بھی سرسید کی تفسیر پیش کرتے ہوئے یہ کہہ بیٹھیں گے ع " من نیز حاضر می شوم تفسیرِ قرآن در بغل " بلکہ حالی نے تو سرسید کو یہ کہا تھا کہ آپ کوئی مولوی تھے کہ تفسیر لکھنے بیٹھے اور اُمت میں تفرقہ پڑ گیا۔ سرسید نے جواب میں کہا کہ میں نے یہ انگریزوں کے لئے لکھی ہے۔ تو حالی کا جواب الجواب یہ تھا کہ پھر اسے انگریزی میں لکھواتے اور لندن میں تقسیم کراتے۔

الحاصل! - غالب آخری عرصۂ حیات تک اپنی وضعداری کو نباہنا اپنا فرض حیات سمجھتے رہے۔ دربار میں ذوق کی ملک الشعرائی تھی غالب کی مستقل رسائی نہ تھی پر اپنے فطری ذوق پر فارسی ہی میں قدیم اساتذہ کی گہرائیوں کے معدن سے نادیدہ روزگار جواہرات کھود کے نکالتے۔ قلعہ کے تعلقات کے بعد اردو غزل گوئی کی طرف مائل ہوئے تو اس میں بھی اپنی انفرادیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اگر بہ نگاہِ عبرت دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہی اس قسم کا مجموعۂ اضداد انسان قدرت نے کبھی پیدا کیا ہو۔ ان چیزوں کی روشنی میں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ غالب بحیثیت اک مصلح کے آئے تھے، پرانے ادب پر جو کائی جم گئی تھی اس کو دور کرنا اُن کا شعارِ زندگی تھا۔

ایک ایسے انسان سے یہ توقع بجا طور پر کم کی جاتی ہے کہ جس کی تمام عمر فنِ شعر کی خدمت میں گزری اُس کی اُردو ادبی اولاد میں ایک کمسن نوعمر بھی ایک اُردو " دیوان زادہ " ہو مگر اس ایک سو صفحہ کے دیوانچہ میں رہ کونسی ادبی چیز نہیں

وہ کونسا شعری جذبہ نہیں وہ کونسی کیفیت حسن نہیں جو اپنی ہمہ گیری اور جدت طرازی کے ساتھ نہ پائی جاتی ہو۔

غالب مرحوم ہونے کے بعد یہی وجہ ہے کہ پچاس سال تک مستورالحال رہے کہ جو اس جیسی باکمال ہستی کے متعلق کسی صورت تصور میں نہیں آتا۔ جب پچاس برس کے بعد زمانے کے تھپیڑوں سے دنیا اس سطح پر آئی جہاں غالب نصف صدی پیشتر ایک زندہ حقیقت بنکر ایک لافانی ورثہ ادبی تمدن کو دے گئے تھے تو لامحالہ یہ امر مسلم ہے کہ اردو ادب کے جملہ ادیب اور انشا پرداز اہل قلم اور مسلم الثبوت شعرا اور دور حاضرہ کے اساتذہ، غالب کی فنکارانہ شخصیت سے بالواسطہ کہ بلاواسطہ متاثر ہوئے اور ہوتے رہیں گے اور اس خصوص میں غالب جگت گرو اُستاد کل کی مسند اعزاز پر بلا شرکت غیرے بیٹھے ہوئے اصلاح شعر دے رہے ہیں۔ اور بلا تفریق ملت سبھوں کو اپنی خطوط نویسی کے ذریعہ پیام وحدت دیتے رہے ہیں۔ اور آج کا یہ اعزاز جشن صد سالہ آپکی اعتراف خدمات کی پہلی منزل میں ہے۔

بدرگاہ ایزد متعال التجا ہے کہ وحدت حق کا طالب غالب اس قومی یکجہتی کا رہنما بنا ہے۔ جسکا یہ کلی استحقاق اسے برحق ہے۔ اسکا یہ احترام اچھے شگون پیش کر رہا ہے کہ اردو کے دن پھرے سمجھو اور صبح کا بھولا شام کو آجائے تو بھولا نہ سمجھو بس یہی سمجھو کہ اب مشترک تمدن کی مشترک زبان اردو جسکا غالب ناخدا تھا۔ اب اپنے دیس میں پردیسی نہ رہے گی اور اسکا سہرا غالب کے سر ہی رہے گا کہ اسی کی روح کی یہ روحانی کرامت ہے ۔

تکملہ

محاسنِ کلامِ غالب کی تصویر کا دوسرا رُخ ۔ ”اعتذار“ :-

”محاسنِ غالب“ پر بہت کچھ رُخ رُخ سے اور طرح طرح سے پیش کیا جا چکا ہے۔ کسی کی مدح اور تعریف میں قلم اٹھانا جتنا آسان اور سہل ہے اُتنا ہی دشوار اور مشکل کسی پر نقد و تبصرہ کے تحت نکتہ چینی کا واہمۂ خیال ہے۔

ہر نقص و عیب سے پاک تو حق تعالیٰ کی شان ہے کہ وہ بہمہ وجوہ خیر ہی خیر ہے
ع ۔ ”بے عیب اک جہاں میں فقط اُسکی ذات ہے“ مگر تنقیدِ حقیقی وہی ہے کہ جسمیں تصویر کے ہر دو رُخ موجود ہوں ورنہ یک طرفہ مدحت طرازی کسی حقیقت بیانی کی حامل نہیں ہے۔

ذاتِ حق کا ہی وہ سراپا ہے، جو بہمہ وجوہ ہر رُخ آئینہ ہی آئینہ ہے۔ اُسکی ذات و صفات کسی حدود مصوری میں نہ آسکے ۔۔ وہ تو قدرت سے اُس کو تو مبرّا از ہر نقص اور پاک از ہر عیب ہونا ہی چاہیئے کہ سب کا مرجع، آسرا، اور سہارا وہی ہے۔ کائنات کا مرتبہ اور مقام بالذات نقائصِ ممکنہ سے مبرّا نہیں جس کو فیضانِ سرمدی سے یہ مقامِ عصمت میسّر ہے وہی معصوم ہے وہی بے خطا ہے۔ جن کی عفت اور عصمت کا سراپا مشیتِ ایزدی پر منحصر ہے، انکے بارے میں کسی سوئے فہمی کی گنجائش نہیں۔ اُن کی طرف کوئی لغزش منسوب نہیں ہو سکی۔ اور یہ کوئی عقیدتِ محققہ نہیں ہے بلکہ ایک نفس الامری حقیقت ہے

کہ ذاتِ "کن فیکان" نے ان کو عصمت دیکر خلق کیا اور ہمیں اَلْاِنْسَانُ مُرَکَّبٌ مِنَ الْخَطَاءِ وَالنِّسْیَانْ ط پر تخلیق بخشی۔ ہم اسی شکر سے عہدہ بر آ نہ ہو سکے کہ قدرت سے ہمیں فیضانِ وجود میسّر آیا۔ ہمارا مقام یہ ہے کہ اگر بشری تقاضے سے کسی غیر معتدل ماحول میں کچھ غلط قسم کی بو تجھ سی اُلجھاؤ پیدا ہو تو خود اپنا قلب یا اپنی اصلاح کا مرکزی نقطۂ نوح اس دا ئمی خیال کی رہبری کو کافی ہے۔

"آدمی آدمی انتر، کیا ہیرا کیا کنکر"۔ ہم سب اس جہانِ رنگ و بو میں کسی رنگ سے بھی ایک جیسے نہیں، اخلاق و کردار میں نہ عیوب و نقائص ہیں۔

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

جب ہم فلک شگاف اُڑان اپنی دماغی صنّاعی پر کرینگے تو لغزش کا بہر حال بحدِ امکان، امکان لازمی ہے۔

قدرت نے اپنی مصلحت پر اپنے تکوینی تقاضوں کے تحت جن کو عصمتی وجود بخشا کہ دوسروں کی رہبری ان سے مقصود تھی ع - او خویشتن گم است کرا رہبری کند - وہی خود گمراہ ہو تو دوسروں کی رہبری کیسے کریگا۔ یہ طبقہ کا ئنات کے لئے اِک عطیۂ ایزد متعال ہے۔ ہماری دسترس سے باہر ہماری تنقید کے احاطے میں نہیں ہے اِسکی قدر و منزلت سبھوں پر واجب ہے۔

گرنا، سنبھلنا، اُتار چڑھاؤ یہ ہمارا حُسنِ خلقت ہے اور ہماری فطرت ہے۔ ہم میں جہاں لاکھ نقائص ہوں وہاں لاکھوں خوبیاں بھی ہونگی۔ اک اہرمنی بغاوت کا ہم میں نہ ہونا ہی ہمارا شرف اور کمال ہے۔

پچھلے صفحات میں جو محاسنِ ادب اک نادیدۂ روزگار ہستی کے پیش ہوئے ہیں ہمارا مطمح نظر یہی ہے کہ جس قسم کے اوصاف زیرِ بحث رہے ہیں اُسی قسم کی تصویر کا دوسرا رُخ بھی اگر احاطۂ امکان میں ہو تو ظاہر کر دیا جائے ورنہ کوئی ایسا واجبی تقاضا نہیں ہے کہ خواہ مخواہ کے عیوب جتائے ہی جائیں اور بلاوجہ اک سعیِ نامشکور کی خاطر قرطاس سیاہ کئے ہی جائیں اُس ہستی کے بارے میں جو خود اپنے بارے یوں کہتا ہے۔

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی ؛ میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

بس غالبؔ کا یہی ایک شعر غفرانِ حق کا ضامن ہے اور ہم اسی پر اس باب کو ختم کر دیں تو ہمیں حق ہے۔ مگر ہمارا روئے سخن عیب بینی نہیں ہے بلکہ تخلیقِ ادب ہے کہ ہمارے سامنے جس ادیب، شاعر کے کمالاتِ سخنوری نے اپنے ادبی رنگِ تحو ہری پر جن اوصاف سے ہمارے دماغوں کو مسحور کیا ہے اُسکی تصویرِ محاسن کا دوسرا رخ ہے بھی یا نہیں یا یہ اور بات ہے کہ ایسی شخصیتوں کے متناقض پر لوگ قصداً مرعوب ہو کر کچھ نہ لکھیں۔

چنانچہ اقبالؔ کو بہمہ وجوہ بشری تقاضوں کے قوم نے "امام الہدیٰ" مانا اور مولانا حالیؔ "پانی پت" محلہ انصاریان کے رہنے والے تھے اور عمر بھر دِلّی میں رہے۔ خود "پانی پت" "دِلّی" کے پڑوس میں تھا۔ اور یہ انصاریوں کا محلہ تو اُردو کا گڑھ تھا۔ مگر دِلّی والوں نے زبان کے معاملے میں حالیؔ کو نہ بخشا اور حالیؔ کو کہنا پڑا ع "حالیؔ کو تو بدنام کیا اُسکے وطن نے" کہ پنجاب کا اُردو کیا جانے تو پھر اقبالؔ سیالکوٹ ٹھیٹ وسط پنجاب کے۔ زبان کے کچھ سقم

اُن کے یہاں رہ جائیں تو کونسی عیب کی بات ہے بلکہ رہنا ہی چاہیئے کہ اُسکے کمال کے لئے سند ہو مگر لوگوں کی اندھی تقلید نے اُسے اک حد تک اور اک عرصہ تک معاف ہی رکھا۔

الحاصل: حسینوں کے جبیں اور رخساروں پر سیاہ تِل قدرتی ہو تو کہنا ہی کیا ورنہ پھر کاجل کا تِل جو خوشنما لگتا ہے وہ محض اسوجہ سے ہے کہ وہ مرکزِ جاذبیت ہے۔ یہ ظلمتِ خالِ مصحفِ رخسار کی تابانی کو مرکوز و مجذوب کرکے ہمیں محظوظ ہونے کا موقع دیتی ہے۔ حُسنِ رخسار کی شعاعیں ہمہ طرف سے یہ تِل کھینچتا ہے)۔ نیز "تعرف الاشیاء باضدادھا" ضد سامنے ہو تو تعارف اچھا ہوتا ہے۔ اگر ہم غالب کی کچھ ادبی فروگذاشتیں فراہم کرنے یا کچھ سمجھانے میں کامیاب ہوجائیں تو تکمیلِ محاسنِ غالبؔ کا سہرا ہمارے ہی سر رہے!

اس تمہید کے بعد کچھ کہنا شاید بارِ خاطر نہ ہو کہ یہ شاعری ہے جو موسیقی اور مصوّری کو در بغل لئے ہوئے گنگناتی ہے اور اک عمر ریاض کے بعد بھی "اک آنچ کی کسر" اسکی کیمیاوی اکسیر کی سربلندی کے لئے رہتی ہی رہتی ہے۔ کہ ع یہاں پگڑی اُچھلتی ہے اسے میخانہ کہتے ہیں"۔ جس غالب نے کسی کو اپنے رنگ میں اپنا ہم سر مانا ہو سبھوں کی تنقیص اُس کے ذہنی کردار میں نمایاں رہی ہو۔ آپ نے "ہجو گوئی" سے اسکو بھی میرا مانا جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں، حالانکہ ہجو ملیح کے دفتر کے دفتر اُسکے یہاں سبھوں کے حق میں موجود ہیں۔

سرِ را ہے محض شاعرانہ ادب سے متعلق غالب کی کچھ ادبی فروگذاشتوں کی کم از کم اگر نشاندھی کر دی جائے کہ یہ پہل ہے۔ تو یہ مضمون تشنہ نہ رہے گا

اور پھر یہ "تصویر محاسنِ غالب" مکمل ہو جائے گی کہ غالب بہت سی نادر خوبیوں کا مجموعہ ہے ۔۔۔ وہ وقت بھی آئے گا کہ خود وقت آپ کو کافی مواد فراہم کر دے گا کہ تکمیل بشریت کا یہی خاصہ ہے ۔

"سیرِ غالب" کے سیر حاصل سابقہ بیانات میں جہاں آپ نے "محاسنِ غالب" کا ہر رُخ سے تعارف حاصل کیا ہے وہیں ضمنی غیر ارادی طور پر کچھ کوتاہیاں بھی آپ نے بوجھ لی ہونگی جن کے لئے ایک مستقل عنوان کی چنداں ضرورت نہ تھی۔
لیکن اسوقت غالب کے مرقع ادب کو ایک خاص نکتۂ خیال سے تو میانہ کیا جا رہا ہے تو مناسب یہی ہے کہ شعری سقم کی بھی بحرِ امکان ہی سہی کم از کم فی الحال کچھ نشاندہی ہو جائے کہ جماعتی طور پر یہ الزام سخن ناشناسی کا اہلِ ادب پر نہ آئے۔
سب سے پہلے تو یہ سمجھنے کی بات ہے کہ غالب کو سمجھنا خود اک پہیلی ہے۔ اگر ہم آزاد منش کہتے ہیں تو ہم کو غالب سے زیادہ اس عالم رنگ و بو میں خوشامد پسند شاید ہی کوئی دوسرا نظر آتا ہو۔ انگریزوں کی بے جا خوشامد تو خیر مستقل ایک کلنک کا ٹیکہ تھی ہی۔ غالب اپنے حلقۂ احباب میں بھی کچھ کم خوشامدی نہ تھے۔ جو اکثر جگہ تواضع کے حجاب میں روپوش رہی۔ نیز قصیدہ نگاری کے ساتھ آزاد منشی کا دعویٰ کچھ زیادہ اپنی صحت کو پیش نہیں کر سکا۔ اور نہ کر سکے گا۔ یہ قصیدہ گوئی خود اپنی خود فریبی ہے کہ وہ خود کو ایسا سمجھے۔ ہم بھی اک زمانہ تک فانی بدایونی کے بارے میں اسی غلط فہمی میں تھے مگر جب ہم نے میر عثمان علیخان نظام کی شان میں فانی کا قصیدہ دیکھا تو ہمارا سابق خیال اور مستحکم ہو کر اپنے موقف پر قائم رہا کہ قصیدہ گو اور آزاد منش کا اجتماع کسی واحد شخصیت میں

ممتنعات سے ہے۔ اس کے باوجود بھی ہم غالبؔ کو اس عیب سے اک حد تک بری سمجھتے ہیں۔ لوگ بیشک دوسروں کی تعریف خوشامدانہ انداز میں کرتے ہوں لیکن غالبؔ کا منشاء و خیال، مقصود خاطر اور مطمح نظر دوسروں کی تعریف اور مدحت سرائی میں خود اپنی تعریف کرانا یا کر لینا ہوتا ہے کہ میں فریدۂ روزگار ایسا قابل ہوں چنانچہ ارشاد ہے ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ ؎ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ جب قلعۂ معلیٰ سے غالبؔ کا تعلق بھی نہ تھا تب بھی غالبؔ کبھی نہ چوکتے اور عید بکریدا اور دوسری تقاریب پر مدحیہ قصاید دربار بہادر شاہ ظفرؔ میں غالبؔ کے پہونچتے ہی رہتے - مقصد اس شہنشاہی ستائش میں دوسروں کی تعریف سے کہیں زیادہ خود اپنی مدح سرائی اور خود اپنی ہی نمائش رہی یہی وجہ ہے کہ غالبؔ نے اُس مقدس ارادت کلام میں جسکو وہ شاہنشاہ نبوت بنانا چاہتے تھے۔ اس میں بھی دو قصیدے ایک لارڈ الگن کا دوسرا لارڈ لارنس کا ملا دیئے کہ وہ اشاعت سے رہ گئے تھے اس واہمہ پر کہ یہ کہیں ہمیشہ کو ہی طباعت سے نہ رہ جائیں۔ ورنہ اس خوشامد افرنگ کی ٹاٹ کا پیوند اس مقدس زربفت کی مدحت میں آخر چہ معنیٰ! اور اسی انداز کی کوئی منقبت علیؓ ہی سہی شامل کر دیتے اور ان خرافات کو کسی دوسرے وقت کیلئے اُٹھا رکھتے یہ ممکن تھا، کم از کم اِس ٹاٹ کے پیوند کا الزام اُس مقدس زربفت و کمخواب میں نہ آتا مگر جو غالبؔ کی فطرت سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس کفر و اسلام کی مخلوط گڈ مڈ سے صرفِ نظر، غالبؔ کا فکر خیال اس میں

یہی تھا کہ کہاں میری یہ کاوش منظرِ عام پر آتے آتے رہ نہ جائے۔

غالب کی عربی دانی کا علمی سواد صرف و نحو سے زیادہ نہ تھا یہ بھی نہیں کہا جاسکتا بلکہ اک دھندلکا سا تصوّر عربی کا غالب کے ذہن میں ضرور تھا کہ یہ بھی کوئی علمی زبان ہے اور اس میں ہی ہمارے وہ تمدنی اثرات تھے جو بتوسط فارسی ہم تک پہنچے مگر غالب اپنی فطری مناسبت سے عربی کے متداول مروّجہ الفاظ اپنے اردو فارسی کلام میں اُسی بڑے وقار قادر الکلامی کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ جتنی کسی ایک اچھے عربی کے فاضل سے توقع کی جاسکتی ہو۔ پھر بھی کسی چیز میں حدِّ کمال کو نہ پہنچنا اپنا عیب کسی نہ کسی رُخ سے کبھی نہ کبھی بتائے بغیر نہیں رہتا۔ چنانچہ عربی کے "تاسّف" مصدر از باب تفعّل مشتق از اَسِفَ کو غالب نے فارسی کے افسوس سے مشتق گردان دیا یہ برہان قاطع والوں سے ادبی چشمک کا زمانہ تھا پھر کیا تھا مخالفوں کی طرف سے خوب لے دے رہی۔ ایسی فاحش غلطی خود اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ غالب نے عربی کے جو الفاظ اپنے کلام میں استعمال کئے ہیں وہ اسکی اعلیٰ درجہ کی ذہانت اور فطری صلاحیت پر دلالت کرتے ہیں کہ اسقدر فنونِ عربیہ کا ناواقف اپنی پوری زندگی میں اتفاقیہ طور پر ایک غلطی کا مرتکب ہو سکا جسکے متنبہ پر غالب نے صمیم قلب سے اعتراف کرلیا کہ میں سمجھا "اَسِفَ" مشتق بہ افسوس ہے۔ یہ اور کریلا نیم چڑھا، عذرِ گناہ بدتر از گناہ، غالب کی عربی نادانی کا رہا۔

اگرچہ اس قسم کی تساہل کاریاں کہ سہل انگاریاں بڑے سے بڑوں کے یہاں ممکن ہیں چنانچہ فرزدق جیسے عربی کے استاد الشعراء کا واقعہ مشہور ہے

کہ اس نے اپنی عربی دانی پر اپنے ایرانی عراقی النسل ہونے کے باوجود خالص عربی النسل خاندان میں شادی کر لی شب خلوت میں اس بیچارے آفت کے مارے کی زبان سے "اُقْتُلِ السِّرَاجَ" نکل گیا کہ چراغ گل کرو یہ ترجمہ تھا چراغ کشتن فارسی کا۔ عربی کا محاورہ "اِطْفَاءُ السِّرَاجِ" چراغ بجھاؤ تھا۔ لڑکی یہ سنتے ہی گھبرائی اور قریب نہ آئی اور رات بھر روتی رہی اور اصبح اللیلُ، اصبح اللیلُ، پکارتی رہی اے رات جلد صبح ہو جا۔ صبح کو قاضی کے پاس جاکر بولی کہ یہ میرا کفو نہیں ہے اور دلیل علامہ کا یہی جملہ "اُقْتُلِ السِّرَاجَ" پیش کیا۔ قاضی نے تسلیم کیا نکاح فسخ ہوا۔ لڑکی اپنے گھر عافیت سے واپس آئی۔ کیا ہم آج کے تمدن میں یہ باور بھی کر سکتے ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ لاکھ زباندانی ہو حافظہ ہی کے بل بوتے پر تو ہو گی مگر اہل زبان ہونا اور چیز ہے۔ اہل زبان کے عام غلط بول بھی اگرچہ غلط العوام قبیح سہی مگر غلط العام فصیح ضرور ہے کہ انھیں کے الفاظ سے زبان بنتی ہے اور نہیں کہلائے تو اس علامہ کے "اُقْتُلِ السِّرَاجَ" اور اسی قسم کی اور کتنی ایسی چیزیں ہر زبان میں ملتی ہیں۔ تبھی تو کہتے ہیں۔ کہ ایک کی "بولی" دوسرے کی "گالی"۔ جن شمال والوں کو جنوب میں منتقل رہنے کا اتفاق ہوا وہ جانتے ہیں کہ ایسے اغلاط کس قدر وہاں کی بولی میں بلیں گے بہر حال غالب کی اس لغزش کے باوجود انکی فطری صناعی کی جامعیت کا بھی کسے انکار ہے؟ شعر ہے ؎ یا مکن با فیل باناں دوستی : یا بنا کن خانہ درخورد فیل دبا، یا درے افراز کن بالائے بیل ـــ یا تو ہاتھی والوں سے دوستی تعلق نہ رکھو نہ بانس ہو نہ بانسری بجے یا پھر انھیں کے یہاں رہ جاؤ گھر بنا کر ورنہ پھر

جب تعلق ہوگا تو وہ آئینگے تو پھر دروازہ اتنا اونچا ہو کہ ہاتھی والے آ سکیں
مطلب یہ ہے کہ یا تو غالب ادبی چشمک کے غل غپاڑے میں نہ پڑتے یا پھر اپنے
اندر وہ جامعیت پیدا کرتے جو اس وقت کے تمدن کے لیے لوازمات سے تھی۔
اور اہلِ ادب اہلِ کمال کو اس میں طرۂ امتیاز اور یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ ازاں
جملہ فنِ تاریخ گوئی بھی ہے جبکہ حکیم مومن خاں مومن اس فن میں اپنا جواب نہ
رکھتے تھے اور غالب کو اس میں دستگاہ نہ تھی تو اس سے ہمیشہ گھبراتے اور ٹال
دیتے کہ مہارت نہ ہونے پر مفت کی سردردی ہوگی اور کوئی کام کی چیز بھی حسبِ دلخواہ
میسر نہ آئے گی۔ چنانچہ نواب علاؤالدین احمد خاں جیسے قریبی متوسلین کی جب
اس فرمائش کو خالی لفظوں میں نہ ٹال سکے تو ایک طومارِ انشا لکھ مارا اور
دو بول تاریخ کے نہ لکھ سکے۔ فرماتے ہیں :—

وہ شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے اور طریقِ صید افگنی
سکھاتا ہے وہ جب جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور
ہو گئے حسنِ طبع خداداد رکھتے ہو ولادتِ فرزند کی تاریخ کیوں نہ نکالو کہ مجھ
پیر غم زدہ، دل افسردہ کو تکلیف دو۔ ابھی خط کافی لمبا ہے۔ ہمیں بتانا یہ ہے
کہ مومن خاں ہوتے تو اتنی کاوش خط لکھنے میں کرنے کی بجائے قلم اٹھاتے اتفاقیہ
تاریخ لکھ دیتے کہ ادبی یادگار بھی رہ جاتی۔ مگر غالب نے اس دردِ سر کی سردردی
سے مہارت نہ ہونے پر ایک طول طویل خط لکھنے کی زحمت مول لی اور سستی
وجوہات بنا کے ٹالنے کی اک ناکام کوشش کی —

غالب نے اپنے مکتوبات اور نجی خطوط میں جن ادبی شہپاروں کی

فنکارانہ انداز میں رُخ نمائی کی ہے تعجب ہوتا ہے کہ یہ وہی غالب ہیں جنکے
دیوان کی بسم اللہ ہی غلط اردو دیوان کا یہ پہلا شعر ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا ؛ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اس شعر کے مہمل ہونے پر اکثروں کا اتفاق ہے۔ حالی نے اپنے ممدوح
کی جب یہ بے توقیری دیکھی، تو خدا ہی بہتر جانے کہ حالی نے خود اپنی طرف سے
بحوالۂ غالب یا غالب ہی سے استفسار کے بعد "یادگارِ غالب" میں یہ توجیہہ
لکھی ہے جو حد درجہ پھُسپھُسی ہے اور جسکی تاریخی شہادت اور صداقت
بھی مشتبہ ہے۔ حالی بحوالۂ غالب کہتے ہیں کہ "ایران میں یہ رسم تھی کہ سرائے
حوت کے تبدیلی کاغذ کا لباس پہنکر اسنے حاکم کے لئے دربار میں آتے تھا سو ہمارا
کہنا یہ ہے کہ آخر اس ایرانی درباری رسم کا کہیں نہ کہیں تذکرہ کسی تاریخ میں تو ہوتا
پھر یہ دلی میں بیٹھ کر وہ بھی اس اردو دیوان کی بسم اللہ خوانی میں یہ شعر کہکر
ہماروں گھنٹا چھوڑے "آنکھ" یہ معنی فارسی دیوان کی ابتدا یا فاتحہ خوانی ہوتی
تو بھی کچھ تھا جتنے معنی اس شعر کے بیان ہوئے ہیں خالی از ابہام نہیں۔
اکثر نے تو غالب کے الہامی کلام کے حروفِ مقطعات سمجھ کر المعنی فی بطن الشاعر
کہہ کر چھوڑ ہی دیا ہے۔ مگر ہم غالب کی قادر الکلامی کے بحدِ اعجاز و کرامت
معتقد ہیں تاہم اسکی ذاتی صلاحیت پر کسی صورت شعر کے مہمل ہونے کے قائل
نہیں ہیں یا سخن فہمی کہیں زیادہ سخن سنجی سے کھلائی گئی ہے۔

اظہارِ سقم اور اسکی امکانی توجیہات

ہمارا تو یہ عقیدہ ہے کہ جب کوئی
ادیب یا فنکار، شعرا ور لفظ پڑھا جاتا ہے

تو جو بھی پھول اُسکے مُنہ سے جھڑیں گے وہ محض کاغذی ہرگز نہوں گے۔ قدرت فیاض نے ان میں کسی نہ کسی انداز کی کچھ نہ کچھ نکہت ضرور رکھی ہوگی چاہے خود شاعر کو بھی معلوم و محسوس نہ ہو یہی حال اس شعر کا ہے ۔ حالی نے بھی تو غالب سے کبھی پوچھا ہوگا جب سمجھ میں نہ آسکا ہوگا اور حالی کے پوچھنے پر جو عذرِ لنگ ڈالے معنی غالب نے بتائے وہ مہمل نہ سہی منطق کا جملہ مہملہ ضرور ہیں۔ دیوان کی ابتدا ہی جب ایسے "کوہ کندن و کاہ بر آوردن" سے ہو تو کسی نہ کسی درجہ میں کسی حد تک قابل التماس ضرور ہے۔ جو پھر ایک مرتبہ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است کی یاد دہرا دیتا ہے۔ مگر ہم نے اِس میں بھی اک لطیف معنی اپنی اِسی "خداوند لفظ" والی عقیدت پر پیدا کئے ہیں اُمید کہ ارباب بصیرتِ غالب دوستی ہیں پسند کرینگے اور اُسکے ابلاغ کی داد دیں گے کہ کلام غالب نادانستہ طور پر بھی اک معجزانہ مقام رکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

نقش فریادی ہے کِس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اس شعر میں کیفِ حُسن کی عالم گیر گیرائی کا وہ جذبہ بیان کیا گیا ہے کہ کُل کائنات عالم حُسنِ قدرت سے متاثر ہے ہم تو ہم خود اس سراپا حُسن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر کا یہ عالم وارفتگی ہے کہ وہ خود اسکے غمزوں کے حُسنِ تظلم کے ناز و ں سے نالاں ہے اور شوخیٔ حُسن سے مست و مدہوش گریباں چاک ہے وہ خود اسیر اسقدر مفتوں ہے کہ اسکے یہ جملہ نقوش و حروف محبوب کی اس شوخیٔ ستم کے فریادی ہیں۔ اور فریاد کے لئے اس عالم عناصر میں جسم و روح کے مرکبہ کی ضرورت ہے

تو جتنے حروف و نقوش اس تحریر کے ہیں وہ سراپا مجسّم تصویر ہیں یعنی مبہوت ہیں۔ اور انکا یہ لباس فریاد آہ و زاری کا کاغذی ہے جو عادتی طور پر لباس نہ ہو مگر ہے کہ تحریر کاغذ پر ہے، اور یہ اُسکے مزید ظلم و ستم کی شاکی ہے کہ یہ لباس حوادثات کا متحمل نہیں ہوتا۔ جل جائے۔ گل جائے۔ بہہ جائے۔ بوسیدہ ہو کر کیا سے کیا ہو جائے" کاغذی ناؤ جیسی کیفیت سمجھو۔ مطلب یہ ہوا کہ "حسن وہ بلا ہے کہ حسینانِ جہاں اور خود ان کا حُسن اپنے سے متأثر اور متألم ہے"۔ اس اظہار بیان کے بعد یہ شعر پڑھتے ہوئے غالب کا شعر پڑھئے اور حُسنِ ابلاغ کی داد دیجیے:۔

نقاشِ ازل نے جو ہی کھینچا ترا نقشا
خود دیکھنے کو رکھ لیا سایہ ترے قد کا

غالبؔ کا اصل رنگ، غزل گوئی ہے۔ غالبؔ اسی میں رہتے تو آج ہمیں اس سلطان التغزل کے ادبی کارناموں سے بہت کچھ ادبی سرمایہ ورثہ میں ملتا اور ہمارا اردو ادب اس سے کہیں زیادہ مالا مال ہوتا۔ چنانچہ جب کبھی اس اپنی عادت کے خلاف غالبؔ سے کچھ خامہ فرسائی ہوئی تو وہ قصیدہ ہو کہ مرثیہ کہ مثنوی "کُلُّ شَیْئٍ یَرْجِعُ اِلیٰ اَصْلِہٖ"۔ غالبؔ قصیدہ کہیں تو غزل کا دھوکہ مرثیہ لکھیں تو غزل کا شبہ اور مثنوی لکھیں تو غزل کا روپ، یہ چیز غالبؔ کے یہاں آپ کو اسقدر مبرہن طور پر نظر آئے گی کہ جو صنفِ سخن بھی آپ اُٹھائینگے غزل کی چاشنی اور ملمع کاری اُسمیں ضرور ہوگی چنانچہ "سہرا" بھی اک قسم کا مدحیہ قصیدہ ہی ہوتا ہے اور یہ خالص ہندوستانی چیز ہے کہ شادی اور دوسرے تقریبات میں پھولوں کے گجرے گلے میں اور سہرا سر پہ نقابی شکل میں رہتا ہے۔

اُس سہرے میں جسکے ردیف وقافیے دفتر کھلا۔ اختر کھلا وغیرہ ہیں باد فیٰ تامل اُس میں بہت کچھ شعری سقم نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلا تو یہی عیب ہے کہ قصیدے میں بیشک شروع میں تشبیب ہوتی ہے جس میں بہار وغیرہ کے مناظر بطور مقدمہ ہوتے ہیں پھر آمدم بر سر مطلب پر تخلیص جسکو ہم گریز" کہتے ہیں وہ ہوتی ہے پھر ممدوح کی ستائش میں لن ترانیاں جسمیں زمین کے قلابے آسمان سے ملائے ہوں یہ سب کچھ ہو ہوا کر دعا کے ساتھ اظہار تمنّا یا بیانِ مدعا مقطع میں یا اُس کے قریب خاتمہ پر پھر قصیدہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ہیں آداب رسمی قصیدے کے مگر غالب کے یہاں ان کی کوئی خاص نہ عام کسی قسم کی بھی پابندی نہیں غالب ہیں کہ چلتے چلتے مدح ممدوح سے ہٹکر مدحت محبوب پر اُتر آتے ہیں اور غزل سرائی کرنے لگتے ہیں۔ یہ فعل ان کا بالکل غیر ارادی اک طبعی مشغلہ اور اک عادتی شغل ہے۔ جو ہر صنف سخن میں موجود ہے یہاں بھی ہے اسکے علاوہ یہاں اور بھی بہت کچھ نادیدنی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ نظم نثر سے اک جدا چیز ہے نثر زیادہ سے زیادہ ایک برجستہ فقروں تک آئے گی اور نظم میں وزن ہے قافیہ ہے ردیف ہے۔ مخصوص بحروں کا التزام ہے اُسکے بعد پھر اور محاسنِ شعری بھی ہوں تو شعر ہے۔ ان میں قافیہ۔ ردیف خاص اور تقطیع کا خاص وزن یہ بنیادی اجزائے شعر ہیں لیکن اس سہرے کی غزل میں جو درباری مقابلہ پر پڑھی گئی قافیہ "ر" ماقبل مفتوح اور ردیف "کھلا" پیش کے ساتھ پیش ہوا ہے مگر اس میں آپ کو اس کے خلاف بھی بہت کچھ ملے گا۔ کہیں قافیہ غلط ہے تو کہیں ردیف غلط جہاں "اختر، دفتر اور در" قافیہ ہے

وہیں "کافر" بکسر کاف بھی ہے اور ایسے ہی بعض جگہ "کھُلا" ردیف موزوں نہیں "کِھلا" بکسر کاف انسب ہے، اور کہیں تو کھُلا بالکل ہی غلط ہے تفصیل تو آئندہ آپ شرحِ ابیات میں ملاحظہ فرمائیں اب تو یہاں مختصراً اشارہ درج ہے مثلاً اس قصیدہ کا وہ شعر جس میں ردیف غلط استعمال ہوئی ہے ملاحظہ ہو:-

واقعی دل پر بَھلا لگتا تھا داغ ؎ زخم لیکن داغ سے بہتر کِھلا

آپ اس کو کھُلا نہیں پڑھ سکتے بصد تکلف اور بہزار دقت بھی نہ پڑھا جا سکے گا کیونکہ پہلے مصرعہ میں "بَھلا" ہے اس کے بالمقابل کِھلا ہی آئے گا اور یہ ردیف نہیں ہے، اور ایسے ہی اس شعر میں سے "تاج زریں مہرِ تاباں سے سِوا

خسروِ آفاق کے مُنہ پر کِھلا

یہاں بھی "مہرِ تاباں سے سِوا" کے مقابلہ پہ کِھلا ہی آئے گا سو یہ ردیف بھی غلط ہو گئی رہی یہ ایسے قصیدے کی پردہ دری آپ کر رہے ہیں جو معرکۃ الآرائی کے طور پہ ذوق کی بدذوقی بتانے کے لیے غالبؔ نے دربار میں پڑھا اور اُس میں ایسے فاش عیوب شعری کہ الاماں! مزید افسوس یہ ہے کہ آج تک حلقہ بگوشانِ عقیدت نے استفہامیہ کی حد تک بھی جنبش قلم کی زحمت گوارا نہ فرمائی۔ عقیدت تو ہم سے زیادہ شاید ہی کسی کو ہوگی جسکو ہم نے "سیرِ غالبؔ" کے مطالعہ کرنے والوں پہ واضح کردیا ہے۔ عقیدت اپنی جگہ ہے مگر فن اور چیز ہے۔

جہاں آسمانِ عرشی پہ چار چاند ہم لگاتے ہیں وہیں سہو۔ بھول چوک بھی ہم سے ہونا ممکن ہے۔ مجھے بھی ۳۸ سال میسور میں صدر شعبہ کی حیثیت سے اساتذہ کو تعلیم و تربیت کے دوران ایسی ذہنی ضمنی چیزوں کے کافی تجربے ہوئے ہیں

اوروں کو تو چھوڑیئے خود اقبال کے یہاں جو ادبی سقم زبان و بیان کے تعلق سے اور عیوبِ شعری کے لحاظ سے دیکھنے میں آئے کہ ردّی کو ردِی - بچوں کو، بچوں اور ہتھکنڈوں کو ہتھکنڈوں باسقاطِ نون پڑھو یا نون غنّہ کے ساتھ تو وزن درست الفاظ غلط - الفاظ صحیح پڑھو تو وزن شعر غلط وغیرہ وغیرہ اور وغیرہ - ایک زمانہ کے بعد "اقبالِ کامل" میں سقم اقبال پر ڈیڑھ دو صفحہ عبد السلام ندوی نے ڈرتے ڈرتے لکھا حالانکہ ابھی اور بھی زیادہ لکھا جا سکتا تھا - ایسے ہی اگر کچھ شعری کوتاہیاں غالب کے یہاں بھی نظر آئیں تو "خذ ما صفا دع ما کدر" کے صداقت ستھرے لوگ "لا ما کدر چھوڑ دو" تو ان کو بھی غالب کی زینتِ حسنِ ادب ہی سمجھنا چاہیئے اور نشاندہی کسی نہ کسی انداز میں لازمی ہے اگر یہ شعری تساہل یونہی رہ گیا تو کبھی تو منظرِ عام پر آئیگا اور آنے والی نسل ہمیں اتنا تو ضرور کہے گی کہ ہم یک چشم تھے اب ہماری بھی عقیدت ملاحظہ ہو۔ اگر آپ لفظ کی صحت پر قافیہ کے غلط استعمال کا الزام غالب کو دینے کے لئے تیار نہیں ہیں تو پھر ہماری سنیں کہ بیشک کافر بکسرِ "ف" ضرور ہے مگر غالب نے کافر بفتح "ف" باندھا ہے - اور یہ مبالغہ ہے بگڑی تصغیر کے مکبر بگڑے جیسا یعنی کافر معمولی اور کافَر بڑا کافر غالب اپنی کھلی اسلامی بغاوت کو جو اسکی علانیہ شراب نوشی سے ہویدا تھی اُسے ڈھکی چھپی نہیں رکھنا چاہتے کہ جب خدا سے چوری نہیں تو بندوں سے کہاں کی۔ اس حقیقت کو اس نے کافر بفتح "ف" سے جتایا ہے تو یہ عیب از عیوبِ قافیہ نہیں ہے۔ باقی کھِلا کو کھُلا پڑھنا کسی قدر تکلف سے شاید کچھ حدودِ جواز میں آجاتے تو یوں سمجھیئے کہ کھُلا بمعنی ظاہر ہوا۔ تو واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ۔۔ ۔۔ لیکن داغ سے بہتر کھُلا۔

مطلب یہ ہوا کہ دل پر تو داغ ہی اچھا لگتا تھا کہ داغدار دل اک کامیاب دل ہے
لیکن مقابلہ پر یہ معلوم ہوا بر ظاہر ہوا کہ زخم داغ سے بھی اچھے ہیں کہ تازہ ہیں شدتِ
الم ہے۔ داغ پچھلے الم کے محض نشان کہلاتے ہیں۔ تو داغ دل کے لئے وجۂ قناعت
ہیں اور زخم بصورت ضیافت ۔ اور یہی صورت دوسرے شعر میں ہے کہ آفتاب
رخشندہ سے بھی زیادہ سنہری تاج شاہِ عالم کے چہرے پر معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال
یہ تاویلیں ہیں ورنہ اصل سقم اپنی جگہ ہے کافر غلط قافیہ ہے اور کم از کم دو جگہ
کھلا غلط ہے۔ نیز تاج کا تعلق سر سے ہے نہ کہ منہ سے یہ بھی ایک مزید شتر گربگی
ہے۔ جو محتاج تاویل ہے۔

نیز اس غزل کے قوافی بھی ملاحظہ ہوں :- دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا"
اس غزل میں سات شعر ہیں مطلع، مقطع ملا کے، مطلع کے دو قافیے اور
باقی چھ جملہ ۸ قافیے ہوئے۔ تسلی کا قافیہ مکرر ہے اسلئے جملہ قوافی سات رہے۔
جن کی تفصیل یہ ہے :- تسلی۔ معنی۔ افعی۔ راضی۔ تقویٰ، وہ بھی۔
عیسیٰ پہلے شعر کا پہلا قافیہ یعنی پہلے مصرعہ میں تسلی ہے۔ تو دوسرا قافیہ دوسرے
مصرعہ میں بھی معنی ہوگا اگرچہ یہاں معنی اور معنیٰ اپنے اپنے معنوں کے ساتھ
ہر دو جائز اور موزوں ہو سکتے ہیں کہ معنی کے معنی ہیں، لفظ کا وہ محل جہاں
وہ استعمال کیا جائے اور معنیٰ کے معنی ہیں، منشا، مطلب، مراد وغیرہ یہاں
ہر دو صورتوں کا جواز ہے۔ افعی، راضی۔ وہ بھی۔ یہ بھی درست ہیں، لیکن
تقویٰ اور عیسیٰ کو تقوِی اور عیسِی پڑھنا بجز شتر گربگی اور کچھ نہیں اور
اگر تقویٰ، عیسیٰ کی رعایت پر تسلیٰ، معنیٰ وغیرہ پڑھا جائے تو صرف ایک معنیٰ کا

قافیہ جوازی حدود میں ہے۔ باقی تسلّیؔ، راضیؔ، وہ بھی اور افقیؔ کسی صورت سقم عیوبِ قافیہ سے بری نہیں ہیں تو غزل کے اکثر قوافی غلط رہے اور پہلی صورت میں دو قافیے نقوؔلی اور عیبیؔلی غلط رہے۔ اور ایسے ہی اجتماع ساکنین آخر شعر میں بصورت اسباغ آتا ہے بر تسبیغ جن اوزان میں آتی ہے محاسن ہی میں شمار ہے۔ جیسے فعولن میں فعولان وغیرہ مگر درمیانِ شعر اجتماع ساکنین میں ایک حرفِ اصلی ضرور تقطیع سے گرے گا اور وہ تسبیغ بھی نہ کہلائیگا کہ وہ آخر شعر میں ہوتی ہے مطلب یہ ہوا کہ دو ساکنوں کو آخر میں تو پڑھ لیا جاتا ہے، جیسے کتابْ حسابْ۔ فغانْ۔ نہان وغیرہ لیکن درمیان میں صرف مدہ اور لین غنّہ اور ہائے مخلوط تو بے عیب تقطیع میں گرتے گرتے کبھی ہلکی سی بو دیکر پڑھے جاسکتے ہیں جیسے زبان ہے مکان ہے مکیں ہے کنواں ہے دھیان ہے وغیرہ اور بعد والے حرف ساکن کو تقطیع میں حرکت دیدی جاتی ہے۔ اگر وزنِ شعر میں گنجائش ہو جیسے کتابؔ ہے حسابؔ میں ہیچ ہے وغیرہ لیکن جب تین ساکن ہوں جیسے زیست۔ نیست۔ کیست۔ پوست۔ دوست اور گوشت وغیرہ میں تو یہ بھی آخر میں روا یا شد میں آتے ہیں لیکن درمیان میں تقطیع کی رعایت پر ایک کو ساکن سے متحرک کیا جائیگا اور دوسرا لازمی طور پر ساقط ہوگا تو یہ سقم غالبؔ کے یہاں کم اور اقبالؔ کے یہاں زیادہ دیکھنے میں آیا ہے چنانچہ لفظ "دوست" کلام غالبؔ میں متعدد جگہ آیا ہے کہیں شروع میں کہیں وسط میں اور کہیں آخر میں۔ آخر میں جہاں آیا ہے وہاں تو بلا سقم درست ہے اور اول اور وسط کے سبب دوست، دوست نہیں" یا سین" گر تا ہے" یا ت" گر یگی اور ایسے ہی "گوشت" کہ اس میں بھی یا شین گریگا یا "ت" ہر دو کی مثالیں

ملاحظہ ہوں :۔ "دوست" کی مثال غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مستفعلن مفاعلن مستفعلن فعول۔ یہاں آخر کے دوست کا سین کسی نہ کسی
درجہ میں ادا ہو رہا ہے لیکن درمیان کا قطعاً گر چکا ہے۔ ایسے ہی "دوست" غمخواری
میں میری سعی فرمائیں گے کیا۔ یہاں شروع میں گرا ہی وزن ہے فاعلاتن فاعلاتن
فاعلاتن فاعلن ۔ اور شین کی مثال ملاحظہ ہو۔ ع :۔
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا وزن ہے فاعلاتن فَعِلاتُن فَعِلاتُن فَعلُن
اور کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جہاں تقطیع میں لفظ گرتے ہیں یا اور کوئی
ذہنی کوفت شعریت کے لئے باعث بدمزگی ہے۔

۱۔ ع۔ اسکی بزم آرائیاں سُنکر دل رنجور یہاں :: بروزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن۔ تقطیع میں یا دلِ رنجر پڑھو تو واؤ گرے، دل رنجو، پڑھو تو را گرے یا پھر اگر دل رنجور یاں پڑھیں تو یہاں کی جگہ یاں کتابت میں متروک ہے، صرف بولی میں مستعمل ہے اور شعر میں ہے بھی نہیں۔

۲۔ ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے ۔ یہاں حَرَکت کی را کو حرکت یعنی حَرَکت پڑھو تو لفظ غلط پڑھا نہ پڑھو تو تقطیع غلط رہی۔

۳۔ دیوانِ غالب کی دوسری ہی غزل ؏ عشق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا،
اس پوری غزل کے ہر ہر مصرعہ کا وزن فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن ہے
لیکن یہ مصرعہ ؏ دل حسرت زدہ تھا مائدہ لذتِ درد :: کہ اس کا پہلا
رکن بجائے فاعلاتن فعلاتن ہے۔ یعنی دلِ حَسْرَت" فَعِلاتُن۔

۴۔ میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی :: سنکے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

اس میں نازکی زگرتی ہے اگر خواہ مخواہ میں بلا وجہ ہر مصرعہ کو توڑ کر دو مصرع بنا لئے جائیں تو پھر یہ نازکی زآخر میں آجانے سے تقطیع میں دو ساکنوں کا تحمل ہو سکتا ہے۔ مگر یہ تاویل ہی کہلائی جائے گی۔

۵۔ غلطیہائے مضامین مت پوچھ ؎ لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں
فعلاتن فعلاتن فعلان ؎ فاعلاتن فعلاتن فعلن۔ دونوں مصرعوں کا توازن تقابل برابر نہیں۔

۶۔ بعض اشعار پر نثر کا دھوکہ جیسے

آکہ میری جان کو قرار نہیں
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں

کہتے ہو کہ نہ دینگے دِل اگر پڑا پایا ؎ دل کہاں کہ گُم کیجئے ہمنے مدعا پایا

عجب نشاط سے جلّاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

وغیرہ وغیرہ — اور بعض غزلوں کی بحریں کچھ نامانوس سی ہیں نیز وہ فارسی تراکیب جن کی ملاحت سے اردو شاعری نے اک خاص تنوّع حاصل کیا اور مرتے مرتے بھی اور اسی غالب ہی کی مسیحائی سے مرقع عروج پر پہنچکر رانی سے ملکہ سبحانی کہلائی انہیں تراکیب میں کچھ پردیسی اجنبیت بھی کہیں کہیں اپنی قند ہاریت بتا رہی ہے۔ جہاں تواتر اور تتابع اضافات کی ثقالت نے

رکاکت کا رنگ لے لیا ہے کہ نمک میں آٹا خوشگواری کا سبب نہیں ہے بلکہ آٹے میں نمک، یہ ایسی ترکیبیں ہیں جن کا تحمل اردو ادب کے لئے بار نہ سہی لیکن اس سے زبان و ادب کو کوئی خاص معتد بہ فائدہ بھی نہیں پہنچا ان کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ انھیں اردو نے کہاں تک اپنایا ہے اور یہ اُسکی قواعد اور اُسکے احاطۂ ادب میں آ بھی سکی ہیں کہ اردو کی اپنی گرامر خاص ہے۔ اور سرمایہ اس میں سیتھی جگہ کا لگا ہے۔ تدریسے تمثیلاً ملاحظہ ہوں :۔

- کاوِ کاوِ سخت جانیہائے تنہائی۔ عشرتِ قتل گہہ اہلِ تمنا
- عشقِ بہر رنگ رقیبِ سر و ساماں۔ عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا
- شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند۔ بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز۔
- خانہ ویراں سازیِ وحشت تماشا۔ وائے محرومیِ تسلیم بدا حالِ وفا۔
- جانِ مطرب ترانۂ ہل من مزید۔ ودیعتِ خانۂ بیدادِ کاوِشہائے مژگاں
- رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں۔ نکوہشِ مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں۔
- رشتۂ عمرِ قطعِ رہِ اضطراب۔ درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر
- سرشکِ سر بہ صحرا دادہ نور العین دامن۔ لبِ پردۂ سنجِ زمزمۂ الاماں۔
- فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن۔ اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں
- طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار۔ صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود
- بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی۔ شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر۔

وغیرہ وغیرہ۔ ہم "ترکیبی اضافات" کے تحت بتا چکے ہیں کہ ایسی ترکیبیں معیارِ فصاحت پر جبھی اُتریں گی جب موقعہ محل اُن کی معاونت کرے چنانچہ

ذیل کی تراکیب بھی مندرجہ بالا تراکیب جیسی ہیں مگر یہاں کا نقابل استحسانا حدِ فصاحت میں شمار ہے کہ موسیقی کی غنائیت کا حامل ہے۔ ملاحظہ ہو

- گوش محروم پیام و چشم محروم جمال۔ نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال۔
- لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ۔
- گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگین۔ تجھ سے ؏ آئینہ داری یک دیدۂ حیراں۔ مجھ سے
- دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے ؏ فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

وغیرہ وغیرہ ۔ نیز اُردو شاعری کے بارے میں یہ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہاں محض بتقاضائے حیا معشوق کا صرف صیغہ مذکر استعمال میں ہے اور حقیقت میں وہ صنفِ نازک ہی کی ترجمانی کر رہا ہے اُسکے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں کہ اُردو شاعری خلافِ فطرت جذبات کی ہمنوائی میں "امرد پرستی" کی حامل ہے فارسی میں تو مذکر مؤنث کے صیغے ہی مشترک تھے پھر بھی حافظ شیرازی جیسی عظیم محترم ہستی پر نیاز فتحپوری نے الزام ہم جنسی کا لگا دیا تھا جو سراسر ناقابل عفو، بہتان اور تہمت ہی رہا تا آنکہ نگار نے توبہ کی اور اللہ اسکی یہ توبہ قبول کرے۔ لیکن اردو ادب میں جب گل و بلبل کی شاعری تھی تب بھی اور اب بھی محبوبہ کو ہی محبوب کے روپ میں اس اُردو ادب نے پیش کیا ہے اس واقعیت پر غالب کا یہ شعر ملاحظہ ہو :-

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا ؏ یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

یعنی صغرِ سنی میں گیسو رخساروں پہ بہار دے رہے تھے بچپن تھا جب سبزہ آغاز ہوا یعنی ڈاڑھی کی پود نکلی جو ابتدا میں سبز رُواں ہوتا ہے اور "سبزۂ خط" کہلاتا ہے تب بھی یہ تیرے زلف و گیسو اپنی اُسی سرکشی رعنائی پر تھے دوسرے مصرعہ میں غالب نے اپنے شاعرانہ

انداز خاص میں حجت پیش کی ہے کہ اس زمرد سے سانپ نہ مرا۔ کہتے ہیں اگر سانپ کے حلق میں زمرد یا ہیرا ڈال دیا جائے تو وہ مر جاتا ہے تو یہاں سبزہ کی مناسبت سے اس ابتدائی ریش کو زمرد کہا ہے اور زلف و کاکل کو ناگن سے تشبیہ تو پرانی چیز ہے مطلب یہ ہوا کہ محبوب کے جوان ریش والا ہو کر بھی وہی غمزے رہے اور اسکی وہی پہلی سی رعنائی رہی اور اسکا حسن وہی پہلا سا غضب ڈھاتا رہا۔ اب ملاحظہ فرمایئے کہ اتنی کھلی صراحت بھی اگر امرد پرستی نہ کہلائے جائے تو پھر کیا کسی اور سوئے منظر کا انتظار ہے کہ برطانیہ میں آج ہم جنسی کا وہ عروج ہے کہ وہ قانوناً پاس ہو چکی ہے اور پادری صاحبان گرجا میں باقاعدہ عقد سے رشتۂ ازدواجی جوڑ رہے ہیں۔ خیر یہ تو انکی تہذیب ہوئی اور ہماری شاعری ہوئی مگر ایک نواب صاحب نے اس نسخہ پر عمل کیا تھا زمرد سانپ کے منہ میں ڈالا گیا تھا مگر سانپ نہ مرا تو معلوم رہے کہ وہ زمرد بھی غالب ہی کا زمردی سبزۂ خط ہوگا کہ وہ حریف دم افعی نہ ہو سکا۔ یہ تو رواجی بات ہوئی کہ جو فارسی سے اردو میں۔ ارادی لاشعوری طور پر آگئی غنی کشمیری بھی فارسی شعرائے عجم کا کہنا ہے۔

حسن سبزے بخطِ سبز مرا کرد اسیر؛ دامِ ہم رنگِ زمیں بود گرفتار شدم

اگرچہ مثنوی غنیمت "نیرنگِ عشق" میں بھی پنجاب علاقہ کے کسی طفلک حسین سے اظہارِ تعشق ہے تاہم وہ فارسی شاعری ہے۔ اردو شاعری پر اس سے کوئی ہم جنسی کا الزام نہیں آتا مگر ہم اسی اپنی غالب سے عقیدت کے غلبہ پر اسکی بھی وہ توجیہہ کرینگے جو غالب کے شایانِ شان ہو ملاحظہ ہو۔ بیشک زلف و گیسو رخسار خوباں پر حسن کو دوبالا کرتے ہیں جن کا تعلق خاص صنف نازک حوروں سے ہی ہے اور یہ ابتدائے جوانی کا غلمانی سبزۂ خط بھی کچھ کم رعنائی نہیں دکھاتا اور آگے یہ حسن و خوبی چند روزہ بود بھیگنے تک ہوتی ہے۔ جب یہ سبزہ اپنی بہار پر

ہوتا ہے تو صدر شکِ حُسنِ نسوانی ہوتا ہے مگر یہاں یہ کبھی نسوانی کاکل سے پٹ گیا تو کہنا یہ چاہیئے کہ درحقیقت یہ شعر تو امرد پرستی کی مذمت اور ہزیمت میں ہے نہ کہ ستائش اور جواز میں کہ حُسن کاکل حورِ نسواں کا غلمانی سبزۂ خط کے بالمقابل بھاری ہی رہا اور زلف و گیسو کی رعنائی سرکشی کو یہ سبزۂ خط نہ دبا سکا یعنی اصل فطرت غیر طبعی عادت پر غالب ہی رہی۔ یہ ہماری ہی عقیدتِ غالب ہے جس نے یہاں بھی غالبؔ کی آبرو بچا لی۔ دوسروں کی تفہیم پر آپ لاجواب ہی تھے — اور بات دراصل یہ ہے کہ ہماری بھی یہ شاعرانہ توجیہات کی اک حُسن فہمی ہے۔ ورنہ بات یہی ہے کہ فارسی ادب میں "امرد پرستی" کے کچھ پس منظر ضرور ہیں کہ اسلامی پردہ خواتین میں لازمی تھا۔ سلاطین اور امرا کو اپنی محفل رقص و سرود کے لئے ان کا ملنا دشوار تھا یہ کام ساقی گری کا ترکی لونڈوں سے لیا جاتا کہ یہ خوش شکل ہوتے۔ اب اسے آپ امرد پرستی، کہیں یا دفع الوقتی بہرحال اک حقیقت تھی چنانچہ چہار مقالہ میں نظامی عروضی سمرقندی لکھتا ہے کہ محمود نے جب ایاز کو زلف و گیسو میں دیکھا تو ذہنی منتشر تھا اس ڈر سے کہ کہیں شہوانی جذبات نہ اُبھر آئیں ایاز سے کہا کہ یہ گیسو کتر ڈال وہ بولا کہاں سے محمود کے کہنے پر ایاز نے دوتہ کر کے دونوں لٹیں کتر ڈالی۔ محمود نے کتری ہوئی دونوں لٹوں کو دربار میں سامنے رکھ کر درباری شاعر کی طرف دیکھا اس نے فی الفور کہا کہ "آراستنِ سرو ز پیراستن است" کہ سرو کی کانٹ چھانٹ کٹنگ سے اسکی نشو و نما ہوتی ہے۔ سرو کی آراستگی پیراستگی سے ہی آراستن اور پیراستن

یہ دو فارسی کے مصدر ہیں۔ پیراستن کہتے ہیں اس خوبصورتی کو جو قطع برید تراش خراش سے پیدا کی جائے جیسے خط بنوانا اور درختوں کی سوکھی ٹہنیوں کی کانٹ چھانٹ اور آراستن کہتے ہیں اس زیبائش کو جو اضافہ سے حاصل ہو جیسے غازہ، سرمہ، مسّی، پوڈر اور گھروں کی سفیدی بالائی آرائش وغیرہ تو شاعر نے کہا کہ ایاز کی زلفوں کو اسلئے کاٹا گیا ہے کہ اس پیراستگی سے اسکی آراستگی آئندہ ہو گی خوب پھلیں گی۔ جیسے سرو اپنی تراش اور کٹنگ سے اچھا سرسبز ہوتا ہے اس واقعہ سے یہی معلوم ہوا کہ دربار میں ترکی لونڈے رہتے تھے اور پھر یہی شاعری میں بھی مرکزِ التفات ہو کر رہ گئے وہیں سے یہ ایرانی شاعری ہندوستان میں آئی۔ چنانچہ اقبالیات میں ہے، ع "نہ وہ عشق میں رہی شوخیاں نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں"۔ ورنہ یہاں کی پرانی ہندی شاعری تو جوگن اپنے سجن سے پریم کرتی سنی ہوتی تھی اور فراق میں شاعری بھی کرتی تھی جو فطری شاعری ہی تھی۔ غرضیکہ اس ایرانی شاعری کے حدودِ جواز کہاں تک ٹھہرے یہ امر قابلِ توجہ رہا۔ اس سے زیادہ اس تکدّرِ طبع کے ہم حامی نہیں اور مزید روشنی ڈالنے سے احتراز اولیٰ سمجھتے ہیں۔ ہمیں غالب کے یہاں بھی ایک شعر نظر آیا جسکو ہم نے تو ہم عدمِ جواز کی حد سے ایک حد تک جواز کی حدود تک پہنچا دیا ہے، اور غالب تو خیر اک رند مشرب شرابی ہی تھے جب میر تقی میر جیسے پاکباز شاعر بھی اس لفظی عیاشی سے نہ بچ سکے۔ فرماتے ہیں ؎

میر جس پہ مرتے ہیں .... ⁂ اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

بہرحال یہ شاعری ہے پیغمبری نہیں ہے ع اب کہ خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا

یہاں کا شاعر کہہ گزرتا ہے اگرچہ استعمال صنعت کے خمار پر ہی سہی ۔ اور بھی کچھ سرا ہے ملاحظہ ہو :۔ غالب کے ان دو شعروں کا پسِ منظر بجز اسکے اور کیا ہو سکتا ہے ۔ "کہ جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے"! خود غالب کے منہ سے قدرت نے "بگذر از مجموعۂ اردو" کی تنے کرادی ۔ شعر ملاحظہ ہو :۔

فارسی بین گر ببینی نقشہائے رنگ رنگ ؛ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ من است

پھر یہ بھی ملاحظہ ہو :۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی ؛ گفتۂ غالب ایکبار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

گویا حکیم صانع نے فارسی کی لن ترانی کو خود غالب ہی سے ہیٹا ثابت کرا دیا یہی ہے اُردو کی فتح اور اُسکی الہامی اعلیٰ مقامی ۔ اگرچہ ہماری مذہبی مقدس زبان عربی ہے مگر اُردو میں قدرت نے وہ جوہر بھرے ہیں کہ یہ اپنی فطری صلاحیت پر ہر زبان کی خوبیوں کو اپنے اندر سمو لیتی ہے ۔ ہر ایک زبان کی خوبی اپنانے کی لچک اسکے اندر قدرت کا دیا عطیہ ہے اسلئے ہم اُردو کو قومی یکجہتی ہی نہیں بلکہ عالمی یکجہتی کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں اور بیانگ دہل ثابت کر چکے ہیں ۔ برادرانِ وطن ہمارے "تاثرات" پڑھیں اور اُردو پر ایمان لائیں ۔ اپنے اسلاف کی طرح کہ انہوں نے ہمیشہ اُردو کا ہی کلمہ پڑھا ہے

جہاں اقبال نے ہتھکنڈوں کو ہتھکنڈوں بلا اعلانِ نون یا بصورتِ غنہ بحذفِ نون استعمال کیا ہے ۔ سوئے اتفاق سے غالب کے یہاں بھی یہ چیز آگئی

ع :۔ "ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے"

یہ ہتھکنڈے اِسی انداز میں بلا اعلانِ نون یا پھر بحذفِ نون بصورتِ غنہ موجود ہے ۔

ہمارا اردو ادب فارسی تراکیب کا دلدادہ قائل اور حامل ضرور ہے اور یہ احسان غالبؔ کا اردو ادب پر بے بدل ہے مگر اس قسم کی ترکیبوں کے لئے جہاں خود فارسی مصدر موجود ہو اردو ادب شاید ہی اپنی لطافت پر اس بارِ گراں کا متحمل ہو۔ جیسے :۔ آگہی دام شنیدن بشگفتن گلہائے ناز۔ باندازِ چکیدن۔ سوختن کا باب تھا۔ وغیرہ اور ایسے ہی اس قسم کی تراکیب کا سازِ انا البحر۔ بجولانِ غلطیدۂ صد رنگ وغیرہ

اگرچہ ذوقؔ جیسے مولوی ملک الشعراء کے یہاں لفظ "یاروں" موجود ہے اور ناسخ کے یہاں "مرے یار" موجود ہے یہ غالبؔ کے یہاں بھی کہیں سے آگیا ہے مگر یہ متانت غالبؔ کے سامنے مکروہ ہی سمجھا گیا ہے۔

ذوقؔ ع نہوا یہ نہوا میر کا انداز نصیب!

ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

غالبؔ ع :۔ کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا۔ اور یہ ملاحظہ ہو

غالبؔ ع :۔ ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایکدن۔ چھیڑیں گے اس میں ابتذال ہے۔ اور بازاری شہداپن ہے۔

اب ہم مزید اس بدمزگی کو طول دینا نہیں چاہتے اس عقیدہ پر کہ آخر اور بھی تو اس تلخ کامی کے حصّہ بردار ہوں گے سبھی کچھ ہمارے ہی ذمہ آخر چہ معنی۔؟ الغرض، الحاصل! ممکن ہے کہ اور بھی کچھ اس قسم کی سہل انگاریاں ہوں جو خوبیوں کے مقابلہ پر یقیناً ہیچ سے ہیچ تر ہی رہیں گی۔ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ہم نشاندھی کے طور پر

احساس تھا۔ اور پوری عمر جو فارسی پڑھی میں صرف کر ڈالی اُسکا بھی احساس زیاں تھا مگر کم۔ ہندی قوم تو مردہ پرست ہے وہ خطوط جنکے چھپنے کا غالبؔ کو بھی اشتیاق رہنے لگا تھا وہ چھپے تو غالبؔ چھپے۔ کچھ کچھ ماہ پہلے چھپے اور کچھ مرنے کے بیس یوم بعد چھپے۔ زاں بعد ان خطوط کے توسل سے غالبؔ کا حلقۂ تعارف بڑھا اور انکے ہی طفیل یہ رطب یابس اُردو شاعری بھی منصۂ شہود پر آئی اور آج تک ہر دو کی پوجا ہو رہی ہے اور ہم نے یہ واضح کر دیا ہے کہ غالبؔ ہمارے اُردو ادب کے لئے امام ادب نظم میں بھی ویسے ہی ہیں جیسے نثر میں اس لئے یہ جزوی سہل انگاریاں ناقابل التفات ہیں اور غالبؔ بہمہ وجوہ ہمارے لئے مرکز التفات ہیں مرجع عقیدت ہیں اور ہم موصوف کیلئے اپنے دل و دماغ میں بہت کچھ قدر و منزلت کے نقشے خاکے رکھتے ہیں اور یہ قدر و مرتبت ابھی ناکافی ہے۔ قومی یکجہتی سے عالمی یکجہتی کی خاطر مزید حلقۂ اثر کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔

والسلام

بندۂ اخلاص حکیم ابوالحسنات بیدل فاروقی

صدر دارالحسنات (سابق صدر شعبہ علوم شرقیہ محکمۂ تعلیمات عظیم تر میسور) حسن المطب شاہ ولایت

سہارنپور۔ یو۔پی

سال کا عطیہ قدرت سے میسر آیا تھا۔ اُردو دیوان چھپنے کے بعد۔ لیکن جب
ہم اس شعر کی روشنی میں قدرے غور و فکر سے کام لیتے ہیں تو ہمارا یہ استعجاب
خود بخود دور ہو جاتا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا :: وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

کہ یہ شاعرانہ تعلّی تھی جس میں واقعات سے کہیں زیادہ واقعیت کی جذبات
نگاری کو دخل ہے جس کے لئے کہنہ مشقی اور علم کی پختگی ضروری ہے کہ یہ روحانی
وجدانی ذہنی شعری شعور زیادہ تر علمی ہوتا ہے نہ کہ عملی۔ اور سوئے اتفاق سے
غالب کا ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ صرف چند فارسی کے شاعر شہر میں تھے وہاں
غالب کو داد دینے والے صرف بجائے مفتی صدرالدین تھے۔ عوام شہری غالب
کی فارسی نگاری سے نامانوس تھے تو کیا قدر و منزلت کرتے اور قلعۂ معلّٰی سے
تعلق نہ تھا کہ آسان اُردو میں کچھ لکھتے وہی بگذر از مجموعہ اُردو۔ خود نظر انداز
تھا لیکن قدرت کو غالب کی ذہانت سے اُردو ادب کو فیض پہنچانا تھا کہ اُدھر
قلعۂ معلّٰی میں داخلہ میسر آیا اور یہ فارسی کی لن ترانیاں ختم ہوئیں ادھر
اُردو خطوط نویسی شروع ہوئی اور اُردو شاعری بھی شاہ ظفر کی قیادت
میں منزلیں ابھرنے اور نیا جنم لینے لگی کہ غدر ہو گیا اور حالات ایسے بدتر ہو کر
صدمے سہے تھے تو غالب اس اسٹیج میں تھے سے مضمحل ہو گئے قویٰ غالب،
اب عناصر میں اعتدال کہاں ۔ کا زمانہ تھا۔ بالآخر غالب کو یہ احساس
ہو چکا تھا کہ میرے اُردو خطوط ملک و قوم پر میرا احسان ہیں۔ آخری مرحلہ
حیات میں غالب کو اپنی اُردو شاعری اور اُردو خطوط نویسی کا قدرے

تتمہ

استظہار و استحضار

ہر قوم کا اک ادبی تمدن ہوتا ہے جو اُسکی ذہنی کیفیات کا ترجمان، اُسکی کیفی وجدانیات کا حامل، اُسکی وصفی کائنات کا علمبردار اور اُسکے معاشرے کا حُدی خواں ہوتا ہے جس قوم کے پاس یہ جوہرِ حیات نہو اُسکو زندہ اقوام کی فہرست میں نہیں شمار کیا جاتا۔ متمدن اقوام ہی صفحۂ ہستی پر زندہ اقتدار کی مالک کہلاتی ہیں اور ہر قوم اپنا تعارف دیگر اقوامِ عالم سے اسی اپنے خصوصی رابطۂ تمدن سیاست پر رکھتی ہے اور پھر یہی جملہ منفرد معاشرے افرادِ عالم کے اپنی یکجائی پر نظمِ عالم کی شکل لیتے ہیں۔ اس ادب اور کلچرل تمدن کے اظہار کے لئے نظم و نثر ہی تحریر و تقریر میں ہر زبان میں لہٗ اظہار ہیں اسلئے اجزائے داخلی قوام تمدن کے یہی ہیں انھیں کے ذریعہ قومی تمدن کا جسدِ عنصری بنتا ہے۔ اسلام میں قرآنِ حکیم نے ہر دو نظم و نثر سے بالاتر حاملِ اعجاز ہوکر اپنا روحانی تمدن پیش کیا ہے باقی عرب و عجم میں، عربستان اور ہندوستان کی یہ خصوصیت مشترک رہی کہ یہاں بولنے سے پہلے گُن گُنانا قومی مزاج بنا اور عرب کی شعر گوئی ان پڑھ ہونے پر بھی مسلّم تھی اس خصوص میں عرب و ہند کو اوّلیت کا درجہ میسّر آیا یہ اظہارِ بیان جب اپنے ارتقائے اعلیٰ کو پہنچا تو اُسکے مختلف دورِ قدیم و جدید ہر دو ملکوں میں اک خاص موقف کے مالک تھے۔ عرب میں خالص دورِ جاہلیت، دورِ مخضر میں (اسلام و جاہلیت کا مخلوط زمانہ) دورِ مولدین ظہورِ اسلام کے بعد کا دور جسکی نشاندہی کرتے ہیں۔ اور ہند میں دورِ میر خسرو علیہ الرحمۃ سے یہ اُردو ہندی کا مخلوط

سنگم ترقی یافتہ ہو کر شاہجہانی دور میں اُردو کہلایا اور پھر اسکے بھی یہ قدیم و جدید
دور اپنے اپنے طرزِ بیان کی خصوصیت پر اک تاریخی شہادت ہیں۔ یہ چیز غالب کے وقت میں
جس خاص اسلوب پر اور جس مخصوص نہج پر اک سج دھج کے ساتھ تھی وہ اُردو کے عرشِ
رفعت معراج کا دور تھا جسمیں دہلی آگرہ اسکول اور لکھنؤ اسکول یہ دو حاملانِ اُردو
ادب تھے دہلی میں ذوق و مومن اور غالب کا غلبہ تھا تو لکھنؤ میں جرأت، مصحفی انشاء
کی انتشار پر غلبہ ناسخ کا خطِ نسخ ناسخ تھا۔ غرضکہ یہ اُردو ادب کی نستعلیق کا زمانہ تھا
اگرچہ اجرائے تمدن میں تمایہ غالب اکثریت کو تھا لیکن یہ کہنا بالکل یک رُخی ہوگی کہ دوسرے
فنکاروں کا تمدن کی ساخت اور قوام میں کچھ دخل نہ تھا۔ اُردو ادب کے تمدن میں جہاں
غالب کا اک مخصوص مقام ہے وہیں ذوق کی کم ذوقی کو بھی بدذوقی نہیں کہا جاسکتا اور
مومن تو عرصۂ غزل میں غالب کی ٹکر پر بہر صورت مانے ہوئے اُستاد تھے اور جس
فنِ تاریخ گوئی کے مومن امام تھے وہاں غالب طفلِ مکتب مقتدی بھی نہ تھے۔ بہرحال
جس نامعلوم پس منظر کے باعث آج ملک و قوم میں غالب کی یادگار منانے کا شوق
اُبھرا ہے ہم اسکو اس خیر سگالی کی نیک فالی ہی سمجھتے ہیں کاش اس نیک شگون پہ
اسی طرح قوم کے صالح جذبات اُبھریں اور دوسرے فنکاروں کے متعلق بھی قوم یہ
وہ ادبی قدر و منزلت کا پُرجوش خیر مقدم جنم لے جسکے وہ مستحق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا
مطمحِ نظر موجودہ قومی رجحانات کے بہ پیشِ نظر اس "سیرِ غالب" کی سیر میں دوسرے فنکاروں
سے صرفِ نظر مطلق نہیں رہا بلکہ اس ادبی گامزنی کو جسکا سہرا آج غلبۂ غالب کو
میسر آیا ہے ہم اس ادبی دوڑ دھوپ کو، ادبی احساس کی پہلی قسط محسوس کرتے
ہیں تاکہ قوم کا ادبی مزاج سدھر کر اپنی فنکارانہ حیثیت کو بروئے کار لانے میں اپنی ذاتی

استعداد پیش کرسکے۔ ہم نے جہاں "سیرِ غالب" میں غالب کے تعارف کو رُخ رُخ سے
نشاندہ کیا ہے وہیں ہم نے زبان کی اہمیت کے پیش نظر یہ بھی بتایا اور جتایا ہے کہ غالب کا
ادبی مقام اگرچہ سنگِ میل کا کام اُردو ادب میں دے رہا ہے مگر اسکے بعد جو ارتقاء اُردو
ادب میں ہوا ہے اُسکو بھی اپنے ادبی ظہور میں جن ادیبوں کا ممنون وجود ہونا پڑا ہے
وہ بھی احسان فراموشی ہوگی کہ نہ دہرایا جائے۔ غالب کا ہمیں یہی کیا کم احسان ہے کہ
اُردو زبان نے غالب کی بدولت چولہ بدل کر ادبی تمدن کے نئے روپ میں جو تازہ جنم لیا ہے
وہ اُردو زبان کی حیات کا ضامن ہے مگر اس تصویر کے دوسرے رُخ پر وہ ناقابلِ انکار
حقائق بھی ہیں جن سے صرفِ نظر محالِ مطلق ہے جن کی روشنی میں حامیان اور بہی خواہانِ
اُردو آج تضاد کے شکار ہیں وہ "ناگفتنی، نادیدنی" اک ناسور حقیقت ہے اور اس پہیلی کو
بوجھنے کے لئے عقلِ انسانی بالکل قاصر ہے کہ اُردو جو ہندوستان کا ہزار سالہ مشترک
سرمایۂ ادب ہے اُسکو تو جلا وطن کیا جا رہا ہے، اسکی بیخ کنی کے منصوبے عملائے جا چکے ہیں اور
ہم اپنی بیگناہی پر کبھی طبِ انسانی لکھ کر اپنے مشترک علاج سے قومی یکجہتی کے نام پر
اپیل کرتے ہیں کبھی "تاثرات" لکھ کر جتاتے ہیں کہ ہندو برادری کی یہ صدیوں کی
اُردو خدمت ہے وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔ اب تعجب یہ ہو تو کیا ہو کہ اِدھر قومی یکجہتی کا بھی بگاڑا ہے،
اور اُسی شہید اُردو مرحوم کے شہنشاہ ادب کی یہ تواضع خدا ہی جانے کس حکمتِ عملی پر
مبنی ہوگی جسکا یہ خیر مقدم کس حقیقت کی وضاحت چاہتا ہے بجز اسکے کہ:۔

چہروں پہ عیاں کچھ ہے مگر دل میں نہاں اور
کرتے ہیں نوازش بھی تو ہوتا ہے گماں اور (بیدل)

شاید یہ مطلع ہماری غزل کا غالب کے اس طرحی مصرعہ پر:۔ ع

"وہ کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور"۔ آج کی ہنگامی ادبی چہل پہل کیلئے
ہی کبھی نازل ہوا ہو۔ اگرچہ بقول غالبؔ یہ حقیقت ہی سہی مگر آج غالبؔ کی قسمت
جو کسی نامعلوم پس منظر پہ جاگی ہے کہ اُردو کے اس شہکارِ ادب کی پوری سرزمین
بھارت پر بحدِ پرستش پرستش اور آؤ بھگت ہو رہی ہے جبکہ ہمارے پڑوسی ملک میں
جہاں کی سرکاری زبان بھی اُردو ہے وہاں کوئی ہنگامہ اس صد سالہ برسی پر نہیں جبکہ
یہاں ایسے بھی علاقے ہیں اور ایسی کئی شخصیتیں ہیں جن کو اُردو سے کوئی خاص لسانی
تعلق بھی نہیں مگر مدحتِ غالبؔ میں وہ بھی آج رطب اللسان نظر آئے گو ہمیں خود ایسا
کوئی پس منظر آج تک سمجھ میں آیا۔ اور شاید آ بھی نہ سکے کہ آخر یہ بے وقت کی راگنی
کس مقصد کے پیشِ نظر راگی جا رہی ہے جبکہ اس سے اہم تر مسائل بجز فرح افتادہ محتاج
التفات ہیں۔ ہم نے بھی ہر قسم کی بدگمانیوں سے ذہن کو پاک رکھ کر ایک مبسوط تعارف
غالبؔ کا "سیرِ غالبؔ" کے عنوان سے لکھا ہے اور ہمارا مقصد اُردو ادب تمدن کی خدمت
کے سوا کچھ اور نہ تھا اور نہ ہے ہم اس حُسنِ ظن میں رہے کہ ملک کے ادیب، اہلِ قلم اور ادبی
ادارے، بلکہ یونیورسٹیاں اور اُنکے صدر شعبہ جب اس دُھن میں لگے ہیں تو بہت سے ادبی
گوشے مزید وضاحت پذیر ضرور ہو نگے اور ہماری یہ ادبی خدمت بھی کسی نہ کسی رُخ سے
اپنا کوئی مقام لیکر اپنی جگہ ہمیں مطمئن کر دیگی۔ مگر اب حال یہ ہے کہ حکومت نے لاکھوں کے صرفے
سے مرحومِ غالبؔ پر جو ممنونیت جتائی ہے وہ محض اینقدر رہی کہ ایک مرکزی وزیر کے
زیرِ اہتمام غالبؔ کی صرف تین کتابوں کی طباعت کا سرکاری نظام موجودہ نسخوں سے تصحیح کے
بعد عملایا جائیگا جو اک مالک مطبع اور کوئی بھی ناشر کر سکتا ہے یہ خدمت کوئی
شاہی خدمت نہیں کہلائی جا سکتی۔ نیز جتنے اہلِ قلم اس مبارزت میں پیش پیش ہیں

انھوں نے بھی اس فرصتِ مغتنم اور اس نادر موقعہ سے لائق تقاضا کوئی افادیت نہیں بیش کی وہی پچھلے تذکروں کی باتیں اپنی اپنی زبان وقلم سے دہرا دینا اور لاکھوں کا صرفہ اس خصوص میں کوئی ادبی تمدنی خدمت نہیں کہی جا سکتی جسکا اکثر و بیشتر حصہ نمائشی حد سے متجاوز نہو سکا ہو۔

ہم نے اپنی سبیرِ غالب کے اشاریہ میں یہ پُر اُمید آرزو ظاہر کی تھی کہ اتنے اہل قلم جب ایک ہستی کے تعارف میں سرگرم تماشا رہیں گے تو ضرور کچھ نہ کچھ انمول نادرات سے اہل ادب مستفید ہونگے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہوا اب ہم بہانگِ دہل فخر سے یہ کہنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں کہ ہم نے غیر ارادی طور پر جن نادرات کا تعارف اپنی چہل سالہ ادبی خدمات کے پس منظر پر اس "سبیرِ غالب" میں کرایا ہے ہم اس خدمتِ غالب سے کافی حد تک مطمئن ہیں کہ ہماری دیرینہ عقیدت آج ایک خاص انفرادیت کی مالک ہے۔ "سبیرِ غالب" میں آپکی وہ ادبی سیری ضرور ہو جائے گی کہ آپ خود بول اُٹھیں گے کہ ہاں غالب بھی کوئی اَن بوجھی پہیلی تھے۔

یہ تو بس اللہ ہی جانتا ہے کہ غالب کی وہ کونسی ادا قدرت کو پسند آئی کہ یہ ہنگامہ اُردو فارسی ہی میں نہیں بلکہ بھارت کی تاریخ میں کالیداس اور اُسکی سنسکرت آکاشی بھاشا کو بھی میسر نہ آیا اور آیا تو ایک ایسے شاعر کی قسمت میں شانِ کریمی کی بے نیازی نے لکھدیا کہ جو اُردو ادب اور اُردو شاعری کو "بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ من است" کہتا تھا۔

بہر حال ہمارا مطمحِ نظر شخصی پہلو سے پہلو تہی ہے یہ اُردو ادب کی خدمت ہے، اور یہ اتفاقِ محض ہے کہ حُسنِ اتفاق، یہ تعارف غالب کے توسط سے اُردو ادب کیلئے

وجود میں آیا ہے اسلئے ہم اس مختصر سے وقفہ میں آپکے سامنے ایک ہلکا سا دھندلکا غالب پر پیش کر رہے ہیں جسکی تفصیل ہماری تعبیرِ غالب میں موجود ہے کہ مردہ پرستی تو خیر ہم ہندیوں کی میراث ٹھہری مگر اس خصوص میں یہ نظرِ انتخاب آخر غالب پر ہی کیوں پڑی جو اپنی پوری زندگی بھر گمنام ناکام رہا اور مرے پیچھے بھی پچاس برس تک اس مغلوب غالب مرحوم کو کسی نے نہ پوچھا کہ آپکے ہم پر اور ہماری زبان پر کیا احسانات ہیں، اور جب قضائے مبرم کہ ایک صدی پیچھے قسمتِ غالب، غالب آئی تو یہ پوچھ اگرچہ بلا دلیل ہے مگر ہو رہی ہے اسلئے طبعی طور پر اسکو قابلِ فہم بنانا ہر اہل ادب کا فنی فریضہ ہے۔ اور اس بے موسمی بارش کو بھی بارانِ رحمت اور ابرِ کرم بتانا ہے کہ کچھ بھی سہی اُردو کے اک فنکار کی پرسشِ حال ضرور ہے اور حلقۂ خواص سے گذر کر جب یہ دل کشی اک عوامی سطح پر آگئی ہے تو ذرے ملاحظہ ہو۔

لوگ غالب کی قبولیت عامہ اور پسند عوام سے آج تک بے خبر ہیں۔ دراصل ہمارا ہندی مزاج اک خاص وجدانی انس شاعری سے رکھتا ہے کہ یہاں کا پہلا ڈرامہ بھی اُردو میں منظوم امانت کا اندر سبھا ہی تھا اور غالب کی اُردو شاعری اپنی رُوانی اغلاق پر تھی۔ لوگ غالب سے مانوس نہ تھے کہ وجہ شہرت ہم ہندیوں کے پاس سوائے شعر کے نہ تھی۔ جب غالب نے اُردو خطوط نویسی میں خود اپنا تعارف پیش کیا جو تو حسبِ ضرورتِ وقت تھا کہ قوم مقفی مسجع پر خود پسندی سے عاجز اور تنگ آچکی تھی اور اس غیر طبعی شرابِ تصنع کا خمار اُتر چکا تھا تو غالب کی اُردو خطوط نویسی کا رنگ ڈھنگ اک خاص انفرادیت کا مالک ٹھہرا اور غالب صاحبِ طرز کہلائے مگر وجہ شہرت ہمارے قومی مزاج پر غالب کی شاعری ہی رہی، سمجھی یو تھی گئی ہو

یا پہیلی رہی ہو مگر اتنا ضرور ہوا کہ غالب کی فطری ذہانت نے جو اپنا جواب آپ تھی اس مہمل شاعری میں بھی بادنیٰ توجہ وہ انوکھی گل کاریاں کر دکھائیں کہ آج چمنستانِ اُردو ادب بہاروں پر لالہ زار نظر آ رہا ہے جس کی کامیابی کا سہرا اوّل تو حالی کے سر ہے کہ اُن کی "یادگارِ غالب" کے تعارف سے غالب زندہ جاوید ہوئے اور علاوہ مخصوص تراکیب اضافی دراضافی میں جن کا موجد غالب ہے، اور جن کو حسرت موہانی نے عمر بھر اپنی شاعری میں اپنا کر اس قابل بنا دیا ہے کہ اُردو شاعری کا بنیادی سرمایۂ ادب اب بھی غالب کی تراکیبِ اضافی ہیں ان پر سیر حاصل تبصرہ "سیرِ غالب" میں کیا گیا ہے مثلاً ملاحظہ ہو کہ مثلاً موجِ دریا اک مفہوم عام تھا اب موجِ کوثر، موجِ آب، موجِ اثر، موجِ سراب، موجِ شباب اور موجِ ہوا وغیرہ ایک مضاف الیہ کی تبدیلی پہ ہزاروں موجوں کے تموج میں غالب کا انداز استعمال اُردو ادب میں اپنی فراخ دامنی پر ناز کر رہا ہے اور کہیں اسکے برعکس مثلاً حاصلِ حسرت، حسرتِ حاصل اور سینکڑوں مضاف کی تبدیلی پر صہبائے خیال، موجِ خیال، نیرنگِ خیال، سرمایۂ خیال، سرتاجِ خیال، برقِ خیال، محوِ خیال وغیرہ اس اضافہ سے اُردو ادب میں گل و بلبل کی جملہ مردہ تشبیہوں کا ہمیشہ کے لئے جہلم ہو گیا اور وہ لافانی سرمایۂ ادب اُردو کو ان تراکیبِ اضافی کی بدولت میسر آیا جس سے آج اُردو زبان و ادب اور اسکی شاعری اک حیاتِ سرمدی کی مالک کہلاتی ہے جسکا باعث غالب کا طرزِ فکر ہے اور یہ آج غالب کی آؤ بھگت اگرچہ غیر متوقع سہی مگر اُسکے اس ناقابلِ انکار احسانِ عظیم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں غالب اس سے کہیں زیادہ اعزاز کا مستحق ہے۔ خدا کرے کہ یہ بھاگ دوسرے فنکاروں کی قسمت کو بھی لگیں کہ اُردو ادب کی زرخیزی میں

مزید وسعتِ خیال پیدا ہو۔ کاش برادرانِ فن اس حقیقت کی روشنی میں خامہ فرسائی فرمائیں کہ عصمت صرف تاجِ نبوت ہے ہماری لغزشوں میں ہی ہمارا ارتقائے محاسن ہے چنانچہ یہاں بھی ہمارا یہی خیال تھا کہ جب کسی شخصیت کی فنکارانہ حیثیت پیش کی جارہی ہے تو "تصویرِ محاسن کے دوسرے رُخ" پر بھی اہل قلم کا قلم سرِ قلم نہ ہوگا بلکہ ضرور اپنے اپنے اندازِ فکر سے رنگ بھرے گا مگر یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر رہا کہ اس وادیٔ پرشور میں سے کوئی بھی نہ گذرا۔ دلی عقیدت اپنی جگہ تھی مگر فنی اظہارِ حقیقت بھی اپنی جگہ تھا یہ کس قدر بھونڈا پن رہا کہ اچھائیاں تو اپنے بیان کر جائیں اور بشری کوتاہیاں غیروں کے لئے چھوڑ دی جائیں کہ وہ من مانی بگاڑ کر جتائی جائیں۔ قدرتی طور پر بشری تقاضے جن سقموں کو ہم سے منسوب کر گئے اُن میں ہماری ہرگز ہیٹی ہے نہ کسرِ شان، ہم نے محتاط صورت میں "محاسنِ غالب کی تصویر کا دوسرا رُخ" کے عنوان میں کچھ ادبی سقم "کملہ" میں سموئے ہیں۔ اور حتی الامکان ان کے بہتر پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ "تصویرِ غالب" مکمل ہو جائے۔ خود اپنا تعارف کرائے اور آپکی مساعی مشکورہ اور آپ کا والہانہ شغف اپنی زبان سے غالب تک ہی نہ محدود رہے بلکہ یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ :- "ع یہ مسئلہ زبان کا اہم ترین مسئلہ ہے"

ہماری زبان اور ہمارا تمدن جس وحدت مزاجی پر مشترک مساعی کے واحد کلچر کا حامل رہا اس میں جو قومی یکجہتی سے بڑھکر عالمی یکجہتی کی یکرنگی پائی جاتی ہے وہ ہماری پچھلی تاریخ کا انمول سرمایہ ہے اور ہم سبھی ہندی اسکے حقیقی وارث ہیں۔ اسی چیز کو ہم نے اپنے "تاثرات" اور "تقاضے" میں مثبت شکل میں پیش کیا ہے کہ یہ سرمایہ اردو ادب ہمارا مشترک خزینۂ تمدن ہے جسکی نگہبانی ہم پر لازم ہے۔"

ضمیمہ

اُردو ادب جس فنکاری کا حامل پچھلے تمدنی برکات پر رہا ہے اُسکے نظم و نثر کے خصوص میں یہ امر مبرہن طور پر نمایاں ہے کہ کائناتِ ادب کے جملہ محاسن کو یہ اُردو ادب اپنی فراخ دامنی پر اپنانے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے گو آج کی فضاء کے مسموم جرثوموں اور اس بادِ مخالف کے تند و تیز جھونکوں سے یہ اُردو زبان اور اُسکا ادب متاثر اور مضمحل ضرور ہے مگر تصویر کا جہاں یہ رُخ ہے وہیں دوسرا رُخ یہ بھی ہے کہ اس اُردو ادب نے اس سرد اعصابی جنگ میں ہندی کو اپنے تمام تر ادبی "تاثرات" بھی دیدیئے ہیں، وہ جملہ فطری تشبیہات و استعارات کا ہزار سالہ تربیت یافتہ سرمایۂ ادب آسمان ہندی کو گمنام طور پر پہنچ رہا ہے جو تعصب کی سنسکرت آمیز نگاہوں سے گو آج اوجھل ہے جونہی یہ عارضی بادل چھٹے اور یہ وقتی تعصب کی گھٹا کی اندھیاری ہٹی اور فضا اپنے اصلی روپ میں آئی تو یہ اُردو شاعری اک نئی بہار زندگی میں جنم لے چکی ہوگی پھر اُسوقت اِن خود بداندیش مخالفوں سے کچھ بنائے نہ بنیگی اور اُردو کی "لپی" اپنی مخصوص دل فریبی پر لاکھ مٹائے نہ مٹ سکی ہوگی۔ اور ہندی "لپی" کے لئے اوّل تو بین الاقوامی حیثیت میسر آنا کسی مستقبل قریب میں ناممکنات سے ہے۔ اور اگر کسی قرنِ بعید میں ممکن التصور بھی ہو تو وہی انگریزی بدنصیبی چولہ کا سوانگ "رومن ہندی" بھرے گی کہ بیرونِ ہند اسکی ترویج کے امکانات بعید از قیاس ہیں جبکہ خود گھر میں ہی تامل ناڈو وغیرہ درجنوں بولیوں سے بچاری شکست خوردہ ہے کہ دنیا کا فطری ارتقائی مزاج اور اُسکا طبعی تقاضا کسی

رعیت تہذیبی کا ہوا خواہ نہیں کہ وہ ہزاروں سال بلا وجہ پیچھے ہٹکر ایک ایسی ناکمل بولی کو قبول کریگا جو اپنے سابق دورِ اقتدار میں ہی نہ "بولی" بولی گئی ہو۔۔۔ کتابی بول رہے ہوں۔ اور یہ کوئی جائز سیاست بھی نہیں ہے کہ اپنے درخت کی پھلدار ٹہنی کو جھانگا جائے۔

چونکہ اُردو ادب کی صالح قدریں بدرجۂ اتم کلام غالب کی ہر دو نظم و نثر میں موجود ہیں۔ اسلئے زبان کی افادیت کے پیشِ نظر ہم نے "سیرِ غالب" اک مبسوط تر مقدمہ زبانِ اُردو کے انداز میں ادبی تمدنی رنگ میں پیش کی ہے تاکہ جب کلام غالب کے محاسن آئندہ آپ کے سامنے "تصویرِ غالب" کی شکل میں شرح ابیات اور نثری نادرات کی وضاحت کی صورت میں آئینگے تو آپ کو اُردو ادب کے جملہ محاسن اور مکمل افادیت سے کماحقہ آگاہی حاصل رہے گی اور آپ بر ملا محسوس کریں گے کہ اُردو ادب دنیا کا آخری ترقی یافتہ ادب ہے جو پچھلے پورے تمدنوں کا نکھار اور ستھراؤ لئے ہوئے ہے اور محاکاتی پہلو سے انسانی فطرت کا ہم نوا اور ہم مزاج ہے۔

ابوالحسنات بیدل فاروقی

صدر، دارالحسنات، محلہ شاہ ولایت

سہارنپور

(یو، پی)

خاتمہ

فارسی قطعہ تاریخ ہجری و عیسوی بر سیرِ غالب

ذوقِ شعری ریختہ شد ریختہ چوں از مطالب   جسمِ اُردو شاعری ہم ماندہ شد بیجان قالب
حق ز لطفِ خود نکردہ رائیگاں اُردو زباں را   ساختہ پرداختہ شد او ز "جانِ فکرِ غالب"
۱۳۸۸ھ

شانِ "عیدِ سیرِ غالب" —— "بُد ز جودِ فضلِ غالب"
۱۳۸۸ھ   ۱۹۶۹ء

اُردو قطعہ تاریخ ہجری و عیسوی بر سیرِ غالب

معہ تاریخ پیدائش غالب

صنفِ سخن میں غالب کیا ہوتے فوقِ غالب   جب تھے نہ پیشِ غالب، مومن کہ ذوقِ غالب
تاریخِ سیرِ غالب ہجری بھی عیسوی بھی   جب تھی "بذوقِ شعری"۔ "اصلاحِ ذوقِ غالب"
۱۳۸۸ھ   ۱۹۶۹ء

غالب رہا سبھوں پر یہ "ذوقِ شوقِ غالب"

۱۲۱۲ھ تاریخ پیدائش

فارسی قطعہ تاریخ عیسوی بر غالب اکیڈمی

بُد بہر صنفِ سخن مغلوب، غالب پیشِ غالب   بیشتر زیں یک صدی آں مرد چوں مُرد غالب
زنگ محفل تا نہ گردد کم ز لطفِ کیفِ شعری   ساختہ شد ایں زماں یکے مجلسے بنامِ غالب

گفت ہاتف ایں کرامت بُد ز "بدلِ فیضِ غالب"
۱۹۶۹ء

اُردو قطعۂ تاریخ ہجری بر غالب اکیڈمی

جب ادب کا بھی مسیحا طب کا ہے عبدالحمید ۔۔۔ کیوں نہ ہو بزمِ سخن کا صدر وہ عبدالحمید
قبرِ غالب پر جو مرجھائی ہوئی کلیاں تھیں آج ۔۔۔ فیض سے رشکِ گلستاں ہیں ترے عبدالحمید

ہے سرافیل "جہانِ صورِ غالب" کا حمید
۱۳۸۸ھ

بند تاریخ ہجری برپیدائش و بروفات و برجشنِ صد سالہ

عجب تھی شخصیت سنسار میں اس مردِ غالب کی ؛؛ شہنشاہی رہی اُردو ادب میں شعرِ غالب کی
جو تھے اُردو کے قائل اُنکو قائل کر کے چھوڑا ہے ؛؛ "کہ سلطانِ غزل" عالم میں ہے "یو روحِ غالب کی
۱۲-۱۲ھ ۔۔۔ ۱۲-۸۵ھ
ہے ذوقِ شوق" کا ماتم اجل ہے" کارِ غالب کی

پیدائش ۱۲-۱۲ھ —— ۱۲-۸۵ھ وفات

ہے یہی جشنِ صد سالہ "جہانِ صورِ غالب" کی
۱۳۸۸ھ

بند تاریخ عیسوی برپیدائش و بروفات و برجشنِ صد سالہ

جہاں میں تھی مسیحائے غزل ہستی جو غالب کی ۔۔۔ مثائے بیاں تم شان سے غالب غالب کی
تن بیجاں ہے اُردو شاعری کیوں مرگ پر اُسکی ۔۔۔ "الم ہے اک قیامت ہے اجل آئی ہے غالب کی"
تاریخ پیدائش ۱۷۹۷ء
جنم لیتے ہی آئی سوگواری "ذوقِ غالب کی"
۱۸۶۹ء تاریخ وفات
وہ کر پہلا جشنِ صد سالہ ہو رسی یادِ غالب کی"
۱۹۶۹ء تاریخ جشن ۔۔۔ ۱۹۶۷ء — ۲ —
(ذو کرہ اضافت کے دو عدد ملا کر)

لاجوابی

یہ تعصب کی بلا انگریز کی لائی ہوئی
قوم سمجھے گی نہ اب بھی ٹھوکریں کھائی ہوئی

بدمذاقی اور کج فہمی سے گھبرائی ہوئی
جل کے جو چوٹے کی رانی کھائی اور چبائی ہوئی

دیس سے پردیس میں اردو کی شنوائی ہوئی
گھر سے بے گھر ہونے پر غم گھر کا ہے کھائی ہوئی

لاکھ اردو بولتے پنجاب اور بنگال میں
اپنے گھر میں وہ مگر جائی سے پرجائی ہوئی

ناز و نعمت کی پلی رانی جو تھی اردو زبان
دل ہے دلی جس کا ہے دلی میں دہلائی ہوئی

اپنے درمن[1] اور زبان سے اپنی ہی یہ بیر کیوں
کھنچی ہے جب پچھلی ہی تاریخ دہرائی ہوئی

کل اسی[2] بھارت میں پوجا ہند کی ہرشی کی تھی
ہے ندامت سے جبینِ ہند شرمائی ہوئی

جنگ میں جینے سے مقدم ہے زباں کا مسئلہ
یہ دھرم کی بات ہے اک سمجھی سمجھائی ہوئی

کاٹ کر اپنی زباں اپنوں نے خود غیروں کو دی
لاجوابی کے زبانوں کی ہے کترائی ہوئی

تھی جو اکلوتی، ہوئی سوتیلی بھی صد حیف حیف
کس نحوست کی گھٹا ہر دیس پر چھائی ہوئی

آج بیدل اس کی ہی کیوں جان کے لالے پڑے
کل سبھوں کو تھی یہاں دل سے وہی بھائی ہوئی

---

[1] پردیسی طریقہ علاج اور اپنی مادری زبان جو سوائے ہند و پاک کہیں دنیا میں مروج نہیں اس سے بیرخی اور پردیسی بدیشی علاج اور زبان سے رغبت، جو خلاف فطرت ہند ہے آخر کیوں ——؟

[2] یہاں کے نیتا یالی بھی باہر ولایت جاتے ہوئے بھارت کا لے جانے اور ملک سے باہر قدم دھرنا پاپ سمجھتے۔ اب یہ عکس فطرت کیوں؟

(بیدل)

چند حقائق

۱۔ آرزو

مذہب کا زبانوں کا تعصب مٹے یکسر — جمہوریہ ہند میں خادم ہو نہ افسر
اُردو بھی رہے ہند میں اوروں کی برابر — اِک شانتی شکتی ہو دھرم سب کا سراسر
اور حق کی بحق سب کو حمایت ہو میسّر

۲۔ فیصلہ

حریت جہاں میں سبکو ہی اپنے حرم سے ہے — یہ فیصلہ زباں کا اہم تر دھرم سے ہے
ہیں ساکھ پر جہاں میں ہزاروں بنے حسنِ ظن — دنیا میں رکھ رکھاؤ کی عزت بھرم سے ہے
یہ دین بھی جہاں ہے — خدا کے کرم سے ہے

۳۔ آزاد منظر

پرچم آزادی کا لہرائے یہاں ہر یت نشاں — ہو نگوں سر دورِ استبداد کا نکبت نشاں
ہندو مسلم ہند میں، جمہوریت کے نام پر — ہے یہی آشا ہماری رہیں وحدت نشاں
ہند کو سچ مچ کہے دنیا — یہ ہے جنت نشاں

۴۔ ثمرِ حریت

رشکِ خور ہر ذرہ میں صد آسماں پیدا کریں — رشکِ گل خاروں سے بھی صد گلستاں پیدا کریں
سارا عالم ہم سے لینے آئے درسِ عافیت — آشتی اور شانتی کا وہ سماں پیدا کریں
اس نظامِ نو میں اپنا بھی مکاں پیدا کریں

فسانہ - افسانہ

ساز ہستی اک نہ اک دن بے صدا ہو جائیگا
عیش ہی سنسار کا یہ بدمزا ہو جائے گا

جب سفینہ ڈوبے گرداب اجل میں عمر کا
ڈوب کر قطرہ میں دریا ہی فنا ہو جائیگا

اور فسانہ اپنا اک افسانہ سا ہو جائیگا

ہمہ دانی

جہانِ رنگ و بو میں کام کب آئی ہمہ دانی
رہی عقل و خرد کی گو یہاں بیشک فراوانی

فلاطونِ زماں سب وقت کے بقراط کہتے ہیں
ہمارے بھی کہیں آڑے آئے کوئی فتنہ سامانی ؟

رہی باقی سبھی داناؤں میں اتنی سی نادانی

دھارا

بنا موجوں کو ساحل اگر کنارے سے کنارا
خودی مت کھو کسی قیمت پہ تو ہرگز خدارا

سہاروں پر ہے جینا اس جہاں میں بدتر از مرگ
تجھے سنسار میں جینا پڑے، جی بے سہارا

بہیگا لامحالہ، زندگی کا ہے یہ دھارا

صد قبلہ نما

یہ دل ہے کبھی اسکو بھی صد قبلہ نما دیکھ
بجز اپنے ہی جلووں کے نظاروں میں خدا دیکھ

ہے فرشِ زمیں، عرش کی رفعت کا سراپا
ہر ذرہ میں صد ذرۂ افلاک ہیں آ دیکھ

اس دامنِ ہستی کو بھی صد چاک ہوا دیکھ

نہیں ملتی

جبینِ سجدہ کو اپنے زمیں نہیں ملتی
زمیں کو ہے یہ شکایت جبیں نہیں ملتی

جبینِ شوق میں سجدے تڑپتے ہیں لاکھوں
بساطِ عرش زمیں پر کہیں نہیں ملتی

جبیں ہو جیسی، زمیں وہ کہیں نہیں ملتی

(از بیدل قادری)

دارالحسنات

محض فرضِ انسانی کے اہم ترین جذبہ احساس پر ادبی ملّی اور وطنی معلومات کا پیش کرنا لازمی سمجھتا ہے۔ ادارے کا مقصد صرف انسانی تعلیم کی سچی اشاعت ہے جس سے ملک و قوم اور ملّت میں خدمتِ خلق کا صحیح ذوقِ عمل بیدار ہوجائے۔ دارالحسنات کی پیشکردہ اشاعات المعراج، البرکات، البشرات، تاثرات، طبِ انسانی، ثقافت، اور اس "سببِ غالب" میں آپ جس ندرتِ فکر اور خالص روحِ انسانی کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلام اور اُسکی تعلیم صرف انسانی قدروں کو اُبھارنے کے لئے قدرت کی طرف سے بنی نوعِ انسان کے لئے ایک رحمت اور اک عطیہ ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلم اپنی سچی اسلامی تعلیم کا عامل بنکر دنیا کی رہبری میں اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوئے پورا پورا حصہ لے کہ امنِ عالم کی واحد کفیل اور تنہا ضامن یہی خدمتِ خلق بروصفِ حق ہے۔ اور قومی یکجہتی سے کہیں اونچی عالمی یکجہتی کی فضیلت اسی تعلیم کو میسر ہے۔

اہلِ علم حضرات سے التماس ہے کہ وہ وقت کی پکار کا اپنے خلوصِ عمل سے ساتھ دیں۔ دارالحسنات سے ماہوار رسالہ "الانسان" کا اجرا بھی اسی مقصد کے لئے ہے۔

ناظم اشاعت

مکتبہ دارالحسنات شاہ ولایت سہارنپور یوپی